مونوگراف

محمد حسین آزاد

عتیق اللہ

اردو اکادمی دہلی

مونوگراف

محمد حسین آزاد

عتیق اللہ

اردو اکادمی، دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر۔ ۱۵۸

Monograph

Mohd. Husain Azad

By

Ateequllah

Pub. by

URDU ACADEMY, DELHI

Print

2008

Rs.50/-

ضابطہ

سنِ اشاعت

۲۰۰۸ء

۵۰/روپے

اے۔آر۔انٹر پرائزز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔پی۔او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-161-5

ترتیب

○ پیش لفظ	سکریٹری	5
○ حرفِ آغاز	وائس چیئرمین	7
○ پیش گفتار مصنف		11
● سلسلۂ سوانح		13
● نسب نامہ		14
● تصنیفات وتالیفات کی زُمرہ بندی		15
● زندگی نامہ		17
○ ادب نامہ		33
● قصصِ ہند		35
● سخن دانِ فارس		39
● نگارستانِ فارس		44
● سیرِ ایران		46
● نیرنگِ خیال		50
● آبِ حیات		64
● دربارِ اکبری		78

- دیوان ذوق 83
- نظمِ آزاد 90
- درسی کتابیں 112
- طرزِ نگارش 114

○ حرفِ آخر 121

○ انتخابِ نظم و نثر 123

- میر تقی میر/آبِ حیات 125
- فارس کے حالات اور فارسی زبان کے خیالات/سخن دانِ فارس 141
- میر ناصر علی سرہندی/نگارستانِ فارس 156
- شیخ عبدالقادر بدایونی امام اکبر شاہ/دربارِ اکبری 161
- مثنوی موسوم بہ وداعِ انصاف/نظمِ آزاد 166
- گلشنِ امید کی بہار 173
- باغِ امید کے دو دروازے 178

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستورالعمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو

بہ نمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر مونوگراف اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اردو اکادمی نے ادبِ عالیہ کے حوالے سے کلاسیکی ادباء وشعراء کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی منتخب تحریروں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ نئی نسل ہمارے مشاہیر کے حیات اور کارناموں سے واقف ہوسکے۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اکادمی کے اشاعتی شیڈول کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا اور ان نوجوان قلم کاروں کو مونوگراف تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی جو ادب کے میدان میں اپنی شناخت قائم کرچکے ہیں۔ میں اس کتاب کے مصنف کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بڑی محنت لگن اور دلجمعی کے ساتھ اس کام کو مکمل کیا اور ہماری درخواست پر اس ذمہ داری کو بھی خود ہی ادا کیا کہ کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ بھی اپنی نگرانی میں کرائی۔ ان کی اس محنت نے اکادمی کے اشاعتی ذخیرے میں بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرغوب حیدر عابدی

سکریٹری

پیش لفظ

ادبِ عالیہ (کلاسیک) کیا ہے؟ اس کا تشخص کن اوصاف وعناصر سے ہوتا یا ہوسکتا ہے؟ ادبِ عالیہ، رومانوی ادب یا جدید ادب کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل ہے یا ہوسکتی ہے جو ان کی آزاد اور علیحدہ شناخت قائم کر سکے؟ ان سوالات پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے شاید اسی نزاع کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ اصطلاحیں (کلاسیک۔ رومانٹک) ادب کی سیاست سے تعلق رکھتی ہیں اور ایسے جذبات کو ابھارتی ہیں جنھیں ہوا کا دیوتا اپنی زنبیل ہی میں رکھے تو مناسب ہوگا۔

یہ دراصل برطانوی نوآبادیاتی شکنجہ تھا جس کے تحت ہم نے اپنے کلچر اور ادب کے مظاہر کو ایسے نام دیے جو انگریزی کی مستند لغات میں مستعمل تھے اور ان سے وہی معنی ومفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جو ان لغات میں درج تھے۔ ان میں ایک اصطلاح کلاسیک تھی جس کا ترجمہ 'ادبِ عالیہ' زیادہ پسندیدہ سمجھا گیا۔ حالاں کہ ادب کے طلبا نے اس سے جو مراد لی وہ تھی قدما کا تخلیق کردہ وہ ادب جو پختگی فن اور جمالیاتی لطف وانبساط کے ساتھ دوامی اوصاف کا حامل ہو۔ جو ایک زندہ روایت کا درجہ حاصل کر کے آنے والی پیڑھیوں کو متاثر کر سکے۔ ہر عہد، جس کی قدر و قیمت اور معنویت کو ازسرِ نو تلاش کرے۔ اور پھر جس کے گھنے سایے تلے نئے تخلیقی پودے نمو پا کر برگ و بار لائیں۔ جزوی فرق کے ساتھ کم وبیش ادبِ عالیہ کا یہی مفہوم اردو میں رائج رہا ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ ان ادبی اصطلاحوں کی سیاست یا اس بحث کی موشگافیوں میں الجھا جائے۔ اپنے مقصد کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم ادبِ عالیہ کے اسی تصور کو ذہن میں رکھیں اور اس کی تلاش وتعبیر میں تھوڑی سی لچک کو بھی گوارا کریں۔

سوال یہ ہے کہ دلّی کے ادبِ عالیہ کے نمائندہ ادیبوں اور سخنوروں کے بارے میں مونوگراف تیار کرانے کی تحریک کیوں کر ہوئی؟ اور اس کتابی سلسلے کا مدعا کیا ہے؟ اس حقیقت سے اہلِ نظر آشنا ہیں کہ ادبِ عالیہ ہی نہیں، معاصر ادب کے مطالعہ کا ذوق وشوق بھی اب ناپید ہوتا جارہا ہے۔ عام پبلشر ہی نہیں بڑے سرکاری ادارے بھی جو اعلیٰ معیار کی کتب شائع کرتے ہیں ان کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اردو کا عام قاری ان کو خریدنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اگر وہ کلاسیکی ادب کے شاہکاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو اسے اکثر ضخیم دیوانوں یا نثری کتب کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ آج کے مصروف انسان کے پاس اتنی فراغت اب کہاں ہے کہ وہ ضخیم دفتر پڑھے۔ تو یہی حال طلبا کی ضرورتوں اور نصابی کتب کی دشواریوں کا ہے۔ باشعور اور خوش ذوق طلبا ادبِ عالیہ کے مطالعہ کا شوق اور جذبہ ضرور رکھتے ہیں لیکن وہ بھی ضخیم اور قیمتی کتابوں سے استفادہ کی ہمت نہیں کر پاتے۔ انھیں معیاری، مستند اور ارزاں کتابوں کی طلب ہوتی ہے۔ اس لیے اردو اکادمی کی اشاعتی کمیٹی نے حال ہی میں ہر پہلو سے غور کر کے یہ طے کیا کہ قدیم عہد کے ادبِ عالیہ کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں پر علمی انداز کے مونوگراف تیار کرائے جائیں۔ دہلی میں ایسے ناقدین اور کلاسیکی ادب کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو حسن وخوبی کے ساتھ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ اشاعتی کمیٹی کی سفارش پر ہم نے ایسے عالموں کی ایک فہرست مرتب کرلی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کمیٹی نے ان اکابر قلم کاروں کی ایک فہرست بھی تیار کی ہے جن کے بارے میں پہلے دور میں مونوگراف تیار کیے جارہے ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

شعرا: فائز دہلوی، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم چاندپوری، شیخ ابراہیم ذوق، میر اثر، مرزا غالب، مومن خاں مومن، نجم الدین مبارک آبرو، شیخ ظہور الدین حاتم، بہادر شاہ ظفر، داغ دہلوی۔

نثر نگار: شاہ عالم ثانی، میر امن، مرزا غالب، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، میر ناصر علی دہلوی، علامہ راشد الخیری۔

یہ فہرست حتمی یا مکمل نہیں ہے۔ اشاعتی کمیٹی اس میں ترمیم وتوسیع کرتی رہے گی۔

ہم نے اہلِ قلم حضرات سے گزارش کی ہے کہ وہ سادہ وشگفتہ اسلوب میں مونوگراف تیار کریں۔ صفحات کی تعداد ۱۱۲ سے ۱۲۸ تک ہوتا کہ یکسانیت رہے۔ اس کا دو تہائی حصہ مونوگراف پر مشتمل ہو۔ یعنی مصنف یا شاعر کی زندگی کے مستند حالات۔ تصانیف اور تصنیفی زندگی کے محرکات۔ اس کی نگارشات کی نمایاں اور منفرد خصوصیات اور دوسری اہم معلومات مونوگراف کا حصہ ہوں۔ اس کے بعد ایک تہائی یا اس سے کچھ کم صفحات میں اس کی تخلیقات کا ایک جامع انتخاب شامل ہو۔

یہ بات ایک حد تک طمانیت کا باعث ہے کہ جن ناقدین نے مونوگراف لکھنے کی ذمہ داری قبول کی انھوں نے اشاعتی کمیٹی کی ہدایات کو امکانی حد تک مانا اور پھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ البتہ دہلی کے چند ممتاز ادیبوں نے خرابیٔ صحت یا کسی دوسری مجبوری کے باعث معذرت کر لی۔

اگر یہ سلسلہ پسند کیا گیا اور اس کی افادیت کو مانا گیا تو نہ صرف اسے جاری رکھا جائے گا بلکہ اسے زیادہ بہتر، دیدہ زیب اور موثر بنایا جائے گا۔

پروفیسر قمر رئیس

وائس چیئرمین اردو اکادمی

پیش گفتار

میں نہ محقق ہوں اور نہ دعویٰ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔ جو کچھ بھی تنقید کے نام سے لکھا ہے اسے بھی محض ایک طالب علمانہ کوشش سے زیادہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ محمد حسین آزاد اور ان کے کام ایک مسلسل تحقیق کا موضوع ہیں۔ آزاد نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ادب کی نذر کر دیا تھا اور اپنی تصنیفات کا ایسا انبار کھڑا کر دیا تھا جسے دیکھ کر سانسیں پھولنے لگتی ہیں کہ یہ لوگ بھی کیا تھے۔ حالات کتنے ہی دگرگوں ہو جائیں، تاریخ کتنا بھی سخت سے سخت آزمائش میں ڈالے، راہیں کتنی بھی مسدود نظر آئیں ان کے پائے استقامت میں کوئی لرزہ نہیں آتا تھا۔ آزاد ایک منصوبہ ساز شخص تھے جو ایک ہی وقت میں کئی خاکوں پر کام کرنے کے عادی تھی۔ انہوں نے حوصلوں کو ہمیشہ تازہ دم رکھا، انتہائی تیرہ وتار فضا میں بھی اپنی قلب گاہ میں امید ورجا کی رمقوں کو مسخ نہ ہونے دیا۔ جوانی کے خاکوں میں بڑھاپے تک رنگ بھرتے رہے۔ ملازمتوں کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں، ایک بڑے کنبے کی کفالت بھی بخیر وخوبی انجام دیتے رہے۔ بہ دوستاں تلطف بہ دشمناں مدارا کے مصداق انہیں اعلیٰ انسانی قدروں کو رہنما اصول بنایا جو وراثتاً انہیں میسر آئی تھیں۔

محمد حسین آزاد بنیادی طور پر ایک شاعر تھے، جو ان العمری تک انہیں جو ماحول میسر آیا تھا، اس کی تشکیل میں استادی شاگردی کی روایت کا ایک خاص درجہ تھا۔ استاد، بلاغت اور عروض کے ماہر ہی نہیں تھے، خود بھی شاعر ہوا کرتے تھے بغیر سند اور معتبر حوالے کے کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی تھی، حالی اور آزاد مشرقی شعریات ہی کے پروردہ تھے۔ غالب اور سرسید سے ایک خاص تعلق خاطر کے باعث حالی کی شاعری اور نثر مرکباتِ لفظی، شبیہہ سازی، مترادف ومتضاد لفظی خوشے خلق کرنے کے عمل، پُر از تصنع عبارت آرائی، اور زبان

وبیان میں ایک علیحدہ امتیاز قائم کرنے کی جستجو سے صاف گریزاں پاتی ہے۔ حالی کی طبیعت ایک مضمون کو ایک رنگ ہی میں باندھنے پر قانع تھی۔ طبیعت کے اسی میلان کے باعث حالی کی نثر میں قطعیت پہلو بھی نمایاں ہوا اور اس نے ایک ایسی زبان کی راہ بھی ہموار کی جو تنقید کے عمل میں استدلال قائم کرنے کی قوت رکھتی تھی۔ انجمن پنجاب کے خطبات سے قطع نظر آزاد کا مطالعہ ایک 'اسلوب کے پرستار' کی حیثیت ہی سے کرنا چاہیے۔ حالی نے اپنے جذبوں اور اپنے مقاصد پر زبان کو مسلّط ہونے سے باز رکھا تھا۔ آزاد کے لیے گل افشانیِ گفتار کی خاص قیمت تھی۔ تاہم آزاد سادہ بیانی کے ہنر سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے سادہ بیانی کے جوہر کو ان کی تخیلی انشا پردازی کے جوہر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسلوب کی یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے میں گھل مل کر ان کے آہنگ نثر کو ایک خاص شناخت مہیا کرتی ہیں۔ اگر کہیں فسانہ عجائب کے اسلوب کی ایک نتھری ہوئی شکل ملتی ہے تو کہیں کہیں میر امن کی زبان جیسی فضا کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وقت کے ایک بڑے فاصلے کے باعث آزاد کے یہاں زبان زیادہ صاف اور شفاف ہوگئی ہے۔

محمد حسین آزاد کی حیات اور ان کی تصنیفات پر یہ ایک مختصر سا مونو گراف (یک موضوعی رسالہ) ہے۔ جو یقیناً بے حد تشنہ اور ناکافی ہے۔ ایک سرسری سے تعارف سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کا میں ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے آزاد کی طرف متوجہ کیا۔ اس بہانے میرے لیے آزاد فہمی کا ایک باب وا ہو گیا اور آزاد پر تفصیل کے ساتھ کام کی خواہش بیدار ہوئی۔ دراصل میری بہت سی تحریریں انہیں کی تحریک اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں۔ اس کی پشت پر بھی ان کا وہ مسلسل مشفقانہ اصرار کام کرتا رہا۔ جس کے باعث میری قلمی یک سوئی اور ذہنی یک جائی برقرار رہی۔ یہ دونوں صورتیں کسی بھی کام کو تکمیل تک پہنچانے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

عتیق اللہ

سلسلۂ سوانح

10 جون	1830	پیدائش
	1834	والدہ ماجدہ کا انتقال
	1847	حصول تعلیم کی غرض سے دہلی کالج میں داخلہ
	1857	والد ماجد مولوی محمد باقر کو پھانسی
	1858	گرفتاری کے خوف سے لکھنؤ کا سفر
	1860	رجب علی کے اخبار، مجمع البحرین کے دفتر میں ملازمت
	1861	لاہور میں ورود
	1861	جنرل پوسٹ ماسٹر کے دفتر میں سررشتہ دار کے عہدے پر فائز
جنوری	1864	ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے محکمے میں ملازمت
20 جنوری	1865	انجمن اشاعتِ علوم مفیدہ (انجمن پنجاب) کا قیام
	1865 تا1868	انجمن پنجاب میں 22 مقالات پڑھے
	1865	ایک خفیہ سیاسی مشن کے رکن کی حیثیت سے وسطِ ایشیا کا سفر
	1866	سرکاری سفر کلکتہ
	1867	انجمن پنجاب کے سیکریٹری مقرر
	1869	گورنمنٹ کالج لاہور میں عارضی طور پر عربی پروفیسر کی حیثیت سے تقرر 1870 میں مستقل کر دیے گئے
	1874	انجمن پنجاب میں مناظموں کا آغاز اور آزاد کا پہلا لیکچر

فروری	1877	نیک نہاد پھوپی کی رحلت، جو آزاد کے لئے ایک بڑا سانحہ تھا
23 ستمبر	1885	ایران کے لئے لاہور سے روانگی
24 جولائی	1886	ایران کی سیاحت کے بعد لاہور واپسی
	1887	ملکہ وکٹوریہ کے جوبلی کے موقع پر شمس العلماء کا خطاب اور خلعتِ فاخرہ سے سرافرازی
	1889	انتہائی لاڈلی اور ہونہار بیٹی امت السکینہ کی رحلت
	1890	عارضۂ جنون کا آغاز
	1892	خرابی صحب کے باعث پینشن
22 جنوری	1910	21 سال تک مخبوط الحواسی کے بعد انتقال

نسب نامہ

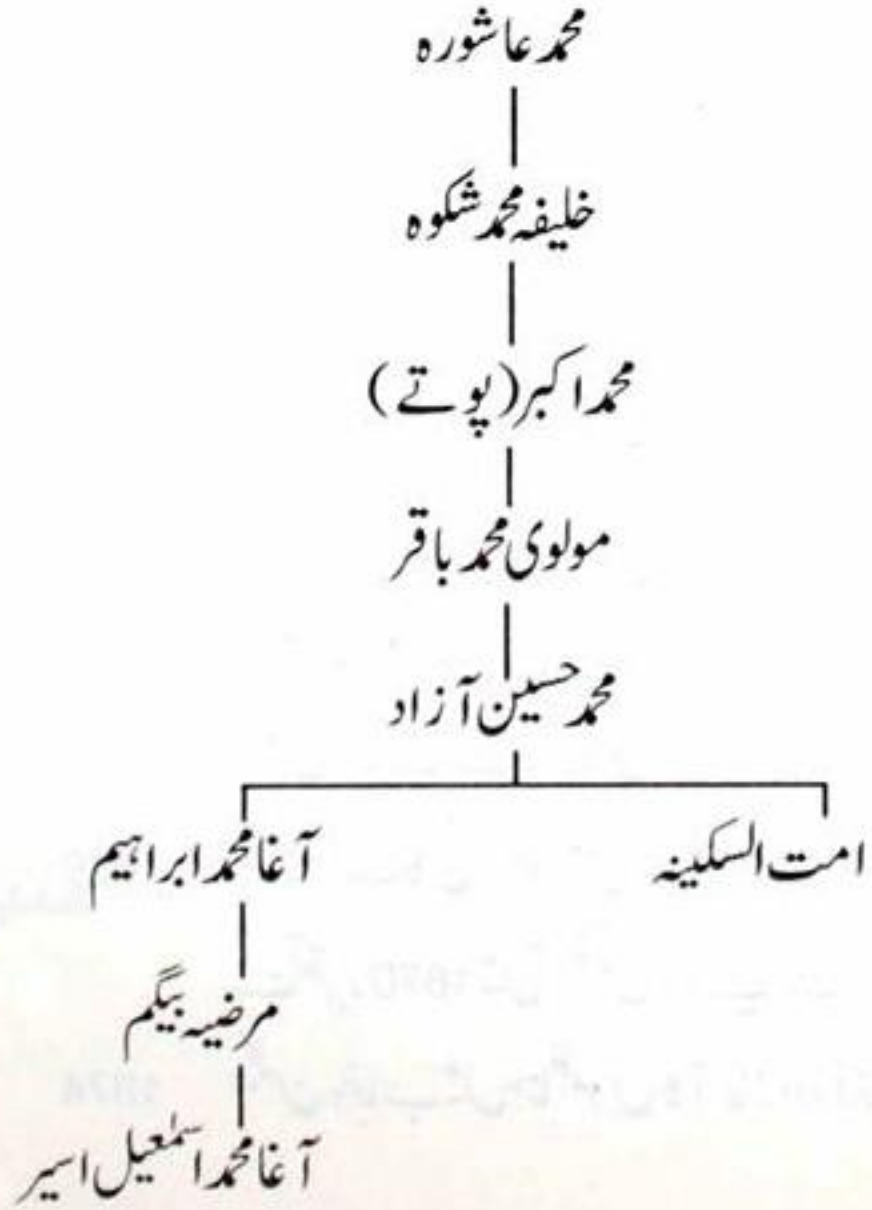

آغا محمد یوسف خلیل

آغا محمد طاہر

آغا محمد باقر

آغا محمد اشرف

تصنیفات وتالیفات کی زمرہ بندی

1- تخلیقی:

نیرنگ خیال (حصہ اول 1880 حصہ دوم 1923)

مجموعۂ نظمِ آزاد، 1896

ڈرامہ اکبر (بعد از وفات 1922)

2- لسانیاتی:

منتخب فارسی شعرا کا تذکرہ

سخندانِ فارس (حصہ اول 1887 وحصہ دوم 1907)

3- تاریخی:

قصص ہند، (جلد دوم) 1868 (نصاب کے لئے تیار کی گئی)

تذکرۂ سنین اسلام[1] (حصہ اول 1874 حصہ دوم 1876)

دربارِ اکبری، 1898

کائناتِ عرب، ملکی، تاریخی وتمدنی حالات (مرتبہ آغا محمد طاہر: 1927)

---

1 حصہ اول 1874 میں شائع ہوا، جو غالباً ڈاکٹر لائٹز کے تعاون سے تیار ہوا تھا۔ حصہ دوم 1876 میں شائع ہوا (یورپ کی تاریخ کا مواد ڈاکٹر لائٹز کا عطا کردہ ہے) طرزِ نگارش آزاد کا ہے تاہم قضیہ مصنف تحقیق طلب ہے۔

4-ادبی تاریخ وتذکرہ:

آبِ حیات (1879)

نگارستانِ فارس 1866 اور 1872 کے درمیان لکھی گئی (مرتبہ آغا محمد طاہر، 1922)

5-سیاحتی:

سیرِ ایران (مرتبہ آغا محمد طاہر)

6-ترتیب وتدوین:

دیوانِ ذوق (اشاعت 1922)

7-اخلاق آموز:

نصیحت کا کرن پھول (1864 میں لکھی گئی، آغا محمد طاہر نے 1917 میں شائع کیا)

8-مابعد الطبیعیاتی:

فلسفہ الہیات[1] 1926 سپاک ونماک، طبع دوم، زیر اہتمام، مولوی میر ممتاز علی (1927)

9- مکتوبات:

مکتوباتِ آزاد (مرتبہ جالب دہلوی، 1923)

10-نصابی:

اردو کی پہلی کتاب

اردو کی دوسری کتاب

اردو کی تیسری کتاب

فارسی کی پہلی کتاب

فارسی کی دوسری کتاب

اردو کا قاعدہ

قواعد اردو

جامع القواعد

---

[1] فلسفۂ الٰہیات اور سپاک ونماک عالم جنون کی یادگار ہیں۔

زندگی نامہ

جس طرح مملکتوں اور قوموں کی تاریخ کی رَو کبھی یکساں نہیں ہوتی اسی طرح ادبی تاریخ میں بھی متوقع اور متوقع سے زیادہ اکثر غیر متوقع نشیب وفراز آتے رہتے ہیں، لیکن ہزار اتار چڑھاؤ کے باوجود ادبی تاریخ کے ارتقاء کا رُخ عمود کی طرف ہی ہوتا ہے۔ رفتار میں سستی واقع ہونے سے ارتقا کے سلسلے پر کوئی بڑی قدغن نہیں لگ جاتی بلکہ ٹھہراؤ کی عارضیت کے بعد اکثر جست LEAP کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کوئی دور اس قدر زرخیز اور بارآور ثابت ہوتا ہے کہ گزشتہ ادوار کے تخلیقی کمالات کا سارا منظر پس منظر کی نذر ہو جاتا ہے۔ بعض ادوار کی خلاقی، فن کاری اور ذخّاری متبادلات کی جستجو میں محض تجربے پر اکتفا کر لیتی ہے۔ عبوری ادوار میں بھی جس قسم کے تغیرات رونما ہوتے ہیں وہ کبھی جزوی اور کبھی کلّی طور پر ادبی تاریخ کی کایا ہی پلٹ دیتے ہیں، چیزیں جتنی صاف دکھائی دیتی ہیں اتنی ہی وہ دھند میں ہوتی ہیں بہت بعد میں جا کر ان کی قیمت کا صحیح علم ہوتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی کا نصفِ آخر ایک ایسے ہی عبوری دور سے تعلق رکھتا ہے جو بے حد خلاق اور ذخّار ہونے کے باوجود اپنی سمت کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک طرف نو آبادکاروں کی تہذیب کی اوپری جگمگاہٹیں، سائنس اور ٹکنالوجی میں ان کی ترقیات کے دفتر، ان کی غیر معمولی تنظیمی اور اختراعی صلاحیت خیرہ کر رہی تھی دوسری طرف ہزاروں ہزار شکستوں اور ہزیمتوں کے بوجھ سے چور وہ ذہنیتیں تھیں جو کسی بھی طرح کے اقدام اور فیصلے کی اہلیت کھو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں تشکیک، تامل اور تردّد کی

گنجائشیں زیادہ نکلتی ہیں اور نئی قبولیتوں کے لیے فضا بندی کا کام بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ بعض ذہن ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماضی کے اسباب کی بنا پر اپنا احتساب ہی نہیں کرتے، مصلحت، مفاہمت اور تحفظ کو ناگزیر باور کر کے مزید انفرادی یا اور اجتماعی خساروں سے بچ نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بعض حضرات نئی قبولیتوں کو نوآبادیاتی غلامانہ ذہنیت کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نئی قبولیتیں اپنی پسپائیوں کی بالا علان قبولیتوں کے مترادف ہوتی ہیں۔ اسے وقت کا تقاضہ کہیے یا وقت کے جبر کا نام دیجیے۔ سارا کھیل طاقت کا ہے اور طاقت میں بھی 'علم کی طاقت' سب سے بڑی اور حاوی طاقت ہے۔ جس کی اہمیت اور ناگزیریت کو ہم نے کبھی سمجھا ہی نہیں۔ غالب، سرسید، آزاد اور حالی سے بھی قبل اربابِ دہلی کالج نے بخوبی جان لیا تھا کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھنا اور سیاست کے نئے میلان پر نظر رکھنا کس قدر ناگزیر ہے، ناگزیر ہی نہیں یہ ایک جبر کی صورت بھی تھی جس سے غفلت برتنے کے معنی اپنے اور اپنی پوری قوم کے حق میں کئی قسم کی نئی مشکلات کو دعوت دینا ہے۔ اس سلسلے میں احتشام حسین کے درج ذیل تجزیے میں جس تذبذب اور کشمکش کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کی اپنی معنویت ہے۔

> ''ماضی کا غم، حال کی پریشانی، مستقبل اور تاریخ کی رفتار سے ناواقفیت، ایسے نئے حالات کی پیدائش، ایسے نئے عناصر کی موجودگی جن سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، قدیم رشتوں کی شکست اور نئے روابط کا واضح شکل میں موجود نہ ہونا، حکومت کی ایک بساط الٹ کر دوسری بساط کا بچھ جانا، تجارت، صنعت وحرفت سے نئے طریقوں کا رواج، پریس اور اخبارات، نئی تعلیم اور نئے وسائل آمد ورفت اور انہیں کے ساتھ مذہب کے مٹنے کا خوف۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ انہوں نے بہ یک وقت پیدا ہو کر شاعروں اور ادیبوں کو الجھن میں ڈال دیا تھا''۔[1]

---

[1] (عکس اور آئینے، لکھنؤ 1962ء صفحہ 115)

یہی وہ تاریخی اور تہذیبی صورتِ حالات تھی جس میں سرسید اور ان کے رفقائے کار، حالی، آزاد، شبلی، نذیر احمد اور شرر وغیرہ کے علمی، ادبی اور عملی اقدامات کی تہہ میں کارفرما ان کی جذباتی اور نفسیاتی گرہوں، ان کے شکوک وشبہات، ان کی دہشتوں اور ان کے خوابوں کے جواز کی ایک دنیا آباد تھی۔ ان سب سے بدترین حالات کا سامنا جس شخص نے کیا تھا وہ صرف اور صرف محمد حسین آزاد تھے۔ جنہیں وزیر آغا نے ان کی سیاحتی طبیعت کے پیش نظر ''مردِ آزاد'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جب کہ ایک سیاحت کے علاوہ ان کی ہر سیاحت کسی نہ کسی سطح پر جبر کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ساری عمر ایک مردِ محکوم کے طور پر ہی بسر کی اور مستقلاً ایک ایسے تناؤ سے گزرتے رہے جس کا اتمام بالآخر جنون پر ہوا۔ عمر عزیز کی آخری دو دہائیاں عالم خیر وشر سے اسی بے خبری کی نذر ہو گئیں۔

آزاد کے جدِ امجد میں محمد عاشورہ ہی وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے محمد شاہ کے عہد میں وادیٔ کشمیر کو اپنا مسکن بنایا تھا، ان کی رحلت کے بعد ان کے بیٹے خلیفہ محمد شکوہ، شاہ عالم ثانی کے عہد میں دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ یہ خاندان عین ان حالات میں ہندوستان وارد ہوا تھا جب کہ کمپنی آہستہ آہستہ نظام حکومت میں دخیل ہو چکی تھی، مشرقی صوبوں میں اس نے کافی حد تک اپنے لیے جگہ بنالی تھی اور مغل شہنشاہیت کا آفتاب روز بروز زوال پر تھا۔ آزاد کے خاندان کو اپنی تہذیبی اور لسانی روایات بے حد عزیز تھیں، لیکن وقت کی دستک کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ فارسی کی جگہ اردو نے بڑی تیزی کے ساتھ لنگوا فرینکا کا درجہ لے لیا تھا۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر کی شادی بھی ایک ایرانی النسل خاندان میں ہوئی تھی تاکہ موروثی نوامیس واقدار کا تحفظ کم از کم گھر کی چار دیواری تک ضرور برقرار رہے۔

مولوی محمد باقر طبعاً ایک مجتہدانہ ذہن رکھتے تھے۔ مذہب کے اعتبار سے شیعہ ضرور تھے لیکن بعض ارباب تشیع کے انتہا پسندانہ رویے کے قائل نہ تھے اور نہ تبرّا کو وہ جائز خیال کرتے تھے۔ ذکر واذکار کی مجلسوں میں وہ ایک مذہبی عالم کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے تھے، لیکن راسخ العقیدہ شیعوں میں انہیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر محمد

صادق (پاکستان) نے ایک واقعے کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔

''جب آزاد نے (دہلی کالج میں) داخلہ لیا تو اس کے بعد ان کے باپ (مولوی محمد باقر) اور مولوی جعفر علی میں، جو کالج میں شعبۂ قانون کے مدرس تھے اور ان کے دوست تھے، ایک زبردست مذہبی[1] مباحثہ شروع ہوگیا۔ تاحال اس مباحثے کا بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ لیکن حال ہی میں ایک چھوٹا سا رسالہ ہاتھ آیا ہے جس میں مولوی باقر پر باقاعدہ کفر کا فتویٰ عائد کیا گیا ہے۔ کیوں کہ راسخ العقیدہ شیعہ ان کے عقائد کو فاسد خیال کرتے تھے..... فتوے کے الفاظ میں (جو شخص) ''نزاعِ سنّی شیعہ کو نزاعِ نفسانی اور شیطانی قرار دے، اور گاہے رنگ اپنا یہ بیان کرے کہ میں میاں شیطان صاحب کو بلکہ کذّابین ظالمین منصوی تک کو بھی اپنی زبان سے برا نہیں کہتا اور اہلِ بیت کے دشمنوں پر تبرّا کرنے کو جو فریضہ مؤمنین کا ہے، حرکت بازاریوں کی اور اسے طریقۂ یزید سمجھتا ہوں''۔[1]

مولوی باقر، کا شمار ان ہستیوں میں کیا جانا چاہیے، جنہوں نے تاریخ کے بطن میں دبی چھپی ہوئی آنے والے انقلابات کی آہٹوں کو سن لیا تھا۔ ان کی ذہنی تربیت دہلی کالج کی علمی فضا اور اساتذہ کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک بے خبر اور اپنے ہی نشے میں سرشار قوم کو نئی آگاہیوں سے بہرہ ور کرنے کی ایک ہی راہ تھی، جو صحافت سے ہو کر جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے پمفلیٹس، دیواری اعلانات و اطلاعات اور انشا پردازی سے مملو فارسی میں تحریر کردہ مکتوبات کے اپنے اپنے حدود تھے۔ مولوی باقر نے قوم کی ذہنی ناداری کے تئیں اخبار کے اجراء کو وقت کے ایک شدید تقاضے کے طور پر اخذ کیا۔ ہندوستان کی دوسری اقوام پورے انہماک کے ساتھ نئی سمتوں کے تعین کو ایک مشن بنا چکی تھیں۔ انہیں نئے علوم یا

---

[1] (محمد حسین آزاد، احوال و آثار، لاہور 1976ء صفحہ 15-14)

انگریزی زبان سیکھنے یا انگریزوں سے روابط قائم کرنے میں کوئی پس وپیش نہ تھا۔ مولوی باقر نے صحافت کا راستہ اختیار کیا کہ اخبار ہی ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو قوموں میں تاریخ کا شعور پیدا کرسکتا ہے۔ کسی بھی حکمت عملی کے فقدان کے باعث رونما ہونے والے اندیشوں اور خطرات سے باور کراسکتا ہے۔ مولوی باقر نے انہیں تصورات کے تحت 1836ء میں ''دہلی اردو اخبار'' جاری کیا جو شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار تھا۔ مولوی باقر کا اپنا پریس تھا جسے انہوں نے اپنے دوست اور دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر سے خرید کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک سرائے، ایک مسجد جو کھجور والی مسجد کہلاتی ہے اور ایک امام باڑہ بھی انہوں نے تعمیر کرایا تھا۔ ان کی حویلی (کشمیری دروازے میں واقع) ہی میں چھاپہ خانہ بھی تھا۔ اور کتب خانہ بھی اور اسی میں ان کی رہائش بھی تھی۔ مولوی باقر کی شخصیت کو اور زیادہ چمکانے اور بلند مرتبت عطا کرنے میں جہاں ان کی کشادہ نفسی نے ایک خاص کردار ادا کیا تھا وہیں ''دہلی اردو اخبار'' کی اشاعت کا بھی کچھ کم اہم حصہ نہ تھا۔

1857ء کا ہولناک تاریخی ثانیہ، جو پوری قوم کے لیے ایک ڈراؤنا خواب لے کر آیا تھا اور جس نے ایک پورے تہذیبی نظام کو تتر بتر کردیا تھا، مولوی باقر اور ان کے خاندان کے حق میں بھی ایک اندوہ ناک پیغام ثابت ہوا۔ دہلی پر باغی ہندوستانی سپاہیوں کے قبضے نے بہادر شاہ ظفر اور دہلی کے باشندوں میں اس یقین کی شمعیں روشن کردی تھیں کہ انگریزوں کی مکمل شکست اب دنوں کی بات ہے۔ مولوی باقر جیسے دور اندیش صحافی تک حالات کا صحیح اندازہ نہیں کرپائے۔ جیسے ہی صورت حال نے نئی کروٹ لی۔ سارے بھرم چکنا چور ہوگئے۔ ایک منظم حکمت عملی نے غیر منظم حکمت عملی کو شکستِ فاش سے ہمکنار کردیا۔ انگریز فوج نے بغیر داد وفریاد سنے گھروں گھر اجاڑے، عمارتیں نیست ونابود کیں۔ جو ہاتھ چڑھا اسے سولی پر چڑھادیا یا توپ سے اڑادیا۔ امام بخش صہبائی کو اپنے 21 اہلِ خاندان کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا، سینکڑوں علماء کو گولی سے ماردیا گیا۔ انہیں سزا یافتگان میں مولوی باقر بھی تھے۔ جنہیں پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ ہڈسن نے ان پر کئی

الزامات لگائے تھے۔ان میں سے چند یہ تھے:

1-ان کے اخبار نے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کو ہوا دی تھی۔ وہ ان جہادیوں اور باغی سپاہیوں کے حق میں پیش پیش تھے جو بہادر شاہ ظفر کے خیر خواہ تھے۔

2-بہادر شاہ ظفر کے ایما پر ''دہلی اردو اخبار'' کے نام کے ساتھ ''اخبار الظفر'' کا نام بھی جڑ گیا تھا۔اس طرح انگریزوں کی نظر میں اس اخبار کی حیثیت شاہی ترجمان کی تھی۔

3-مسٹر ٹیلر کے قتل کے ذمہ دار بھی مولوی باقر ہی تھے۔

جہاں تک مسٹر ٹیلر کے قتل کا معاملہ ہے۔اس کی روداد بس اتنی ہے کہ باغی سپاہی جب کئی بے قصور انگریزوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار رہے تھے،اس مہم میں باشندگانِ دہلی بھی سڑکوں پر اتر آئے تھے۔مسٹر ٹیلر اپنی جان بچا کر جیسے تیسے مولوی باقر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔مولوی باقر نے انہیں پوری اعزاز کے ساتھ تحفظ بھی مہیا کیا،لیکن کسی طرح اس بات کی خبر باغیوں تک پہنچ گئی۔اس سے پہلے کہ وہ لوگ محاصرہ کرتے،مولوی باقر نے مسٹر ٹیلر کو بھیس بدلوا کر خاموشی سے گھر سے روانہ کر دیا،ابھی مسٹر ٹیلر تھوڑی دور ہی پہنچے تھے کہ کسی نے انہیں بھانپ لیا اور برسرِ راہ ہی موت کی نیند سلا دیا۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ باغیوں نے جب مولوی باقر کی حویلی کا محاصرہ کر لیا اور مولوی باقر کو جان کی دھمکی دی جانے لگی تو خود مسٹر ٹیلر نے ان سے رخصت کی استدعا کی،اس بارے میں جہاں بانو بیگم نقوی نے لکھا ہے کہ جب باقر کے مکان کو گھیر لیا گیا اور دھمکیاں دی جانے لگیں کہ گھر کو آگ لگا دیں گے تو اس پر بھی مولوی باقر ٹس سے مس نہ ہوئے۔'' مولوی صاحب کو گھر کا برباد ہو جانا منظور تھا مگر اپنے مہمان کو حوالہ کر دینا گوارہ نہ تھا۔جب مسٹر ٹیلر نے جوشِ عقیدت اور اظہارِ خلوص کا یہ رنگ دیکھا کہ ان کی خاطر مولوی صاحب کے گھر پر آنچ آئے گی تو ان کی شرافتِ نفس اور پاکیزگی ضمیر کو جوش ہوا،اپنے استاد سے ضد اور اصرار کر کے باہر نکل کر آئے۔ان سے پہلے اظہارِ تشکر میں ایک لاکھ پچہتر ہزار کے نوٹ مولوی صاحب کی نذر کیے۔پھر دنیا کی بے اعتباری اور غدّاری کا جو خیال آیا تو اپنے دستخط بھی کر دیے۔(جسے ہڈسن نے جعلی

قرار دیا) اور یہ صاف صاف لکھ دیا کہ یہ رقم میں نے بطیب خاطر مولوی صاحب کی نذر کی ہے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مسٹر ٹیلر جوں ہی باہر نکلے۔ قضا کے ہرکاروں نے..... اس بے گناہ کا قتل کر ڈالا۔''

ہڈسن نے مولوی باقر کی حقیقت بیانی پر ذرا کان نہیں دھرا۔ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا، مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ خوف ودہشت کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ ساری ملکیت ضبط کرلی گئی، سارے اخبارات نذر آتش کردیے گئے۔ کسی کو مولوی باقر کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کے حوالے سے ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے کہ جب آزاد پوری طرح لٹ پٹ گئے اور سامانِ سفر کے طور پر دیوانِ ذوق کو سینے سے لگا کر اپنے (غالباً) بائیس اہل خاندان کے ساتھ دہلی سے کوچ کرنے لگے تو ''اس بے بسی کے عالم میں آزاد نے اپنے والد کے ایک دوست سے مدد طلب کی جو فوج میں افسر تھا۔ اس نے انہیں کچھ عرصہ سائس کے بھیس میں ملازم رکھا۔ ایک دفعہ وہ انہیں اپنے باپ (مولوی باقر) کے پاس بھی لے گیا۔ یہ بڑی ہی مختصر اور کرب آمیز ملاقات تھی۔ باپ بیٹا بڑی حسرت سے ایک دوسرے کو دور ہی سے دیکھتے رہے اور پھر ایسے جدا ہوئے کہ کبھی ملاقات نہ ہوسکی''۔

☆

آزاد 10/جون 1930ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی چار برس ہی کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ 1877ء میں ان کی پھوپی بھی چل بسیں، جنہوں نے ماں کی طرح ان کی پرورش کی تھی۔ ماں کی رحلت کے وقت تو انہیں کوئی شعور نہ تھا، بعد میں بھی ماں کی جدائی کا احساس ان کے لئے جاں کاہ نہیں بنا، لیکن پھوپی کا غم ایک ناقابل برداشت غم تھا۔

☆

تاریخ نے ابھی پوری طرح کروٹ نہیں لی تھی۔ انگریز اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کو مجتمع

کر چکے تھے۔ انہیں ایک مناسب وقت کا انتظار تھا، جب کہ مغل شہنشاہیت اپنے شباب پر پہنچ کر بڑی سرعت کے ساتھ زوال آشنا ہو چکی تھی۔[1] مرہٹوں اور سکھوں اور آپسی نفاق نے انگریزوں کے بلند کوش مشن کی کامرانی کے لیے بڑی آسانیاں فراہم کر دی تھیں۔ ظاہر میں بڑی آسودگی تھی، نئی تعلیم اور نئی صنعتوں اور نئی ٹکنالوجی کے چرچے عام ہوتے جا رہے تھے۔ دہلی کالج کے قیام نے کئی گھرانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ مولوی باقر نے قدیم طرز ہی کی ابتدائی تعلیم پائی تھی جس میں عربی، فارسی اور دینیات پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں دہلی کالج میں داخلے کے بعد ان پر ایک نئی اور اجنبی دنیا کا بھی انکشاف ہوا۔ اسی تاثر نے آزاد کے لیے بھی دہلی کالج کی راہ ہموار کر دی۔ اس کالج کی زندگی میں وہ 1847ء میں داخل ہوئے۔ یہ کالج کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو بڑی خاموشی مگر استقامت کے ساتھ ایک مشن کے طور پر ذہن سازی کا کام انجام دے رہا تھا۔ سرسید کے مشن کی طرح اور ایک وسیع پیمانے پر اس نے تشہیر و تبلیغ کو اپنا مقصد نہیں بنایا تھا اس لیے اس کی مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کا پیچ بھی بہت بلند نہ تھا۔

آزاد کو وسیع المشربی کا پہلا سبق اپنے والدین ہی سے ملا تھا۔ یہی تصور لے کر انہوں نے دہلی کالج میں داخلہ لیا تھا جہاں مولوی جعفر علی جیسے غالی قسم کے شیعہ استاد بھی تھے۔ مولوی باقر علی اور مولوی جعفر علی کے مذہبی تنازعات کا واقعہ ابھی تازہ دم ہی تھا۔ خود آزاد خاصا دینیات کا علم رکھتے تھے (مولوی باقر انہیں مولوی بنانا چاہتے تھے) کالج میں مولوی جعفر علی سے ان کی نہیں بنی۔ دونوں میں مناظرے کی ایک وجہ عقائد کا اختلاف ہی تھا۔ موقعہ کی نزاکت کو جان کر پرنسپل نے آزاد کو مولوی سید محمد کے سپرد کر دیا جو سنّی فقہہ کے استاد تھے۔ آزاد ایک بے حد ہونہار طالب علم تھے انہیں مضمون نویسی کے کئی انعام بھی ملے۔ دہلی کالج نے ان کی ذہانت پر جلا کا کام کیا۔ ان کے انداز نظر میں جو واضح تبدیلیاں واقع ہوئیں

---

[1] 1803ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہو چکی تھیں۔ انگریز فوج نے مرہٹوں کو دہلی سے نکال باہر کیا تھا۔ شاہ عالم میں نہ تو جنگ کی سکت تھی اور نہ فوج کی کفالت کی طاقت، عملاً 1857ء سے تقریباً نصف صدی قبل ہی دہلی، ہاتھ سے جا چکی تھی۔ شاہ عالم کا گزارا انگریزوں کی پینشن پر مبنی تھی۔ جو بہادر شاہ ظفر تک جاری رہی۔

ان کی پشت پر دہلی کالج کی تربیت اور والد کی صلح کل کے نظریے کا بڑا دخل تھا۔ اسی نظریے نے انہیں زندگی بھر شہنشاہ اکبر کا گرویدہ بنائے رکھا۔ دربار اکبری اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ جہاں تک ان کی شادی کا سوال ہے۔ اس بارے میں تفصیلات تقریباً لاپتہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے بھی بس یہ اشارہ کیا ہے کہ جنگ آزادی سے قبل ان کی شادی ایک گھوڑوں کے سوداگر، مرزا عسکری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ غالباً یہ اس زمانے کا واقعہ ہوگا جب وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اخبار نویسی میں اپنے والد کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

☆

محمد حسین آزاد کی زندگی میں شیخ ابراہیم ذوق کا ایک اہم مقام تھا۔ ذوق ملک الشعراء تھے۔ اور خاقانی ہند کہلاتے تھے۔ استادی شاگردی کے علی الرغم بہادر شاہ ظفر کا ان پر تلطف خاص تھا۔ ذوق نے ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول شوق سے پائی تھی، مزید تعلیم کے لیے میاں عبدالرزاق کے مدرسے میں داخلہ لیا، جہاں مولوی باقر ان کے ہم مکتب تھے، یہیں سے دوستی کا وہ رشتہ قائم ہوا جو آخر تک برقرار رہا۔[1] ذوق کی جوان العمری کا خاصا وقت علوم متداولہ کی تحصیل میں گزرا، شاعری کی طرف بعد میں پوری توجہ دے سکے۔ شاہ نصیر کی استادی اور کمالِ فن کی شہرت دور دور تھی۔ سوانہیں سے وابستہ ہوگئے۔ قدرت نے خلاقی اور طباعی کا غیر معمولی جوہر انہیں ودیعت کیا تھا۔ مولوی باقر سے تعلق دیرینہ کی وجہ سے آزاد نے بچپن سے ان کے علم وفن سے فیض اٹھایا۔ وہ بے نیازی، وہ استغنیٰ وہ قناعت پسندی جس سے استاد کی شخصیت کے پیکر نے تشکیل پائی تھی، آزاد کے لیے سرمایۂ جان وایمان تھی۔ آزاد اپنے استاد سے والہانہ شیفتگی رکھتے تھے، جس میں عقیدے کا پٹ

---

1 آزاد نے کسی جگہ لکھا ہے:

''والد مرحوم کا اور ان کا آغازِ تحصیل میں ساتھ ہوا تھا۔ ساتھ پڑھے، ساتھ بڑھے۔ ہر معرکے میں شریک حال رہے اور تھوڑے فاصلے میں دنیا سے رخصت ہوئے مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا، اور جو حال نہیں دیکھے، وہ بھی اس طرح سنے ہیں گویا سامنے گزرے ہیں۔''

بھی شامل تھا۔ ذوق کے انتقال کے وقت آزاد چوبیس برس کے تھے۔ ذوق کی رحلت آزاد کے لیے بہت بڑا غم تھا۔ انہیں یہ بھی قلق تھا کہ 'دیوانِ ذوق' استاد کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔ آزاد ابھی بکھرے ہوئے کلام ذوق کی شیرازہ بندی میں مصروف ہی تھے کہ 1857ء کا خوں آشام مرحلہ سامنے آ گیا جس نے آزاد کے نظام زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

☆

1857ء کے ہنگامے، والد کے دردناک موت، ساری املاک کی ضبطی اور چھاپے خانے اور کتب خانے کی بربادی نے ان کے مستقبل کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ چار برس کی عمر میں والدہ کے سایۂ عاطفت سے پہلے ہی محروم ہو چکے تھے۔ کتابیں ان کے دل وجان تھیں یہ ایک موروثی اثاثہ تھا، جس کی محرومی ان کی زندگی کا ایک بڑا المیہ تھی۔ جن کتابوں کو انہوں نے حرز جاں بنا رکھا تھا، ان میں کلام ذوق کا خاص مرتبہ تھا، جس کی تدوین ان پر قرض بھی تھی اور خواب بھی تھا۔ انہوں نے اپنے مختصر ترین اندوختے میں کلام ذوق کو صحیفے کے طور پر جگہ دی تھی جو آخر دم تک حتیٰ کہ دور جنون میں بھی ان کے حافظے کے نہاں کدوں میں رچا بسا رہا۔ مولوی باقر کی گرفتاری کے بعد ہی سے بعض مخبر آزاد کے خلاف بھی اپنی کارگزاریوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ جس کی بھنک انہیں پڑ گئی تھی۔ پہلے تو وہ دہلی اور اس کے قرب وجوار ہی میں چھپتے چھپاتے رہے، جب اندیشے زیادہ بڑھ گئے تو مشرق اور جنوب کی راہ لی۔ دو ڈھائی برس اسی دربدری اور کسمپرسی میں گزارنے پڑے۔ جب عام معافی کا اعلان ہوا اور زمام حکومت کمپنی سے ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں میں چلی گئی، تب آزاد اپنے تمام کنبے کے ساتھ لکھنؤ میں پناہ گزین تھے۔ اس ذیل میں ڈاکٹر محمد صادق نے ''مرحوم دہلی کالج'' کا یہ حوالہ مقتبس کیا ہے کہ آزاد جنگ آزادی کے بعد بھاگ کر ایران نہیں گئے (جیسا کہ مشہور کر دیا گیا تھا) 1858ء میں جب عام معافی کا اعلان ہوا تو وہ اس وقت، اپنے بیان کے مطابق لکھنؤ میں تھے (ملاحظہ ہو آبِ حیات صفحہ 152) اور نہ ہی غدر کے فوراً بعد ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تھے۔ کئی سال بعد ان کے ایک رشتے دار کی

رپورٹ پر ان کے خلاف فوج داری مقدمہ دائر کیا گیا جسے غالباً مولوی رجب علی یا ڈاکٹر لائٹنر کی سفارش پر واپس لے لیا گیا تھا، بہرحال جب تک وہ لاہور منتقل نہیں ہو گئے، اندیشوں کی تلوار ان کے وجود پر لٹکی رہی۔

1857ء کے بعد دہلی کی ساری بزم آرائیاں ملیامیٹ ہو گئیں۔ لکھنؤ میں مذہبی عقیدے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مرثیہ خوانی، نوحہ خوانی اور ذکر واذکار کی مجلسوں کی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ مرثیہ اہل لکھنؤ کے لیے ایک اجتماعی کیتھارسس کا سبب بن گیا۔ شہادت حسینؓ کے نوحے کی لَے میں سقوطِ لکھنؤ کا درد بھی شامل تھا۔ دہلی پر یہ افتاد نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی سے بھی زیادہ گہری پڑی تھی۔ شاہی دربار کے بعد جن امراء اور روؤسا کی ڈیوڑھیوں میں امید کی کچھ کرنیں گڑی تھیں۔ انہیں بھی سیاہ بختیاں نگل گئیں۔ دہلی کالج کی ذہن سازی کی روایت میں تعطل واقع ہو گیا۔ یہ ایک واحد ادارہ تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ علمی مضامین کے ترجمے کا آغاز دہلی کالج ہی سے ہوا تھا، جو آپ اپنے میں ایک ناقابل فراموش کارنامہ تھا، جس کا سلسلہ یک لخت رک گیا۔ انگریز سامراج کو اب نہ تو سنسکرت سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ عربی و فارسی سے اور نہ ہی اردو ان کے مقاصد کو جلا بخش سکتی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری طاقت انگریزی کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ کالج کا کتب خانہ بھی اس داروگیر کی زد میں آیا، اسے لوٹا بھی گیا اور نذرِ آتش بھی کر دیا گیا۔ کالج کے کئی اساتذہ ہجرت کر گئے۔ کچھ شہید کر دیے گئے۔ 1877ء میں اس کالج کا انضمام لاہور کالج میں ہو گیا۔ دہلی کالج اب محض ایک یادداشت میں محفوظ ہیولیٰ تھا اور بس!

☆

واردانِ لاہور میں آزاد کا نام سب سے اول آتا ہے۔ ان کے بعد جن نامور ہستیوں نے دہلی کو خیرباد کہا ان میں حالی، پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین اور منشی درگا پرشاد کا شمار ہوتا ہے۔ لاہور میں ان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے کنبے کی کفالت تھا۔ نو واردان

کو جس طرح کسی بھی اجنبی شہر میں اپنی جگہ بنانے، اپنی صلاحیت منوانے اور اپنی توفیق آزمانے میں دقتیں آتی ہیں، آزاد کے سامنے بھی وہی مرحلہ تھا۔ وہ ابتدائی ایام میں کچھ عرصہ جگراؤں میں رہے۔ جہاں مولوی رجب علی ارسطو جاہ کے اخبار ''مجمع البحرین'' سے وہ تقریباً ایک برس تک وابستہ رہے۔ یہ 1860ء کی بات ہے۔ اس کے فوری بعد جنرل پوسٹ آفس لاہور میں سررشتہ دار کے عہدے پر ان کا تقرر ہوگیا۔ جہاں انہوں نے تین برس تک کام کیا۔ 1864ء میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے دفتر میں نوکری مل گئی۔ اس سے بھی انہیں اطمینان میسر نہیں آیا۔

☆

ڈاکٹر لائٹنر کی کوششوں سے 20/جنوری 1865ء کو انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ جو آزاد کے لیے ایک نیک فال ثابت ہوا جہاں وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ ان کی کارکردگی اور ان کی شمولیت سے انجمن پنجاب کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں دوچند اضافہ ہوگیا۔ ڈاکٹر لائٹنر کے لیے یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ انہیں جس طرح کے آدمی کی ضرورت تھی۔ وہ ساری خوبیاں آزاد میں موجود تھیں۔ 1867ء میں آزاد اس کے سیکریٹری بنا دیے گئے۔ یہ منصب نہ صرف ان کے شایان شان تھا بلکہ یہاں ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کے مزید پروان چڑھنے کے سارے مواقع حدِ امکان میں تھے۔

ڈاکٹر لائٹنر خود ایک بڑی منصوبہ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے مغربی علوم اور انگریزی زبان کو اس انداز سے فوقیت نہیں دی جس طرح 1857ء سے قبل اور اس کے فوری بعد کے عرصے میں دی جا رہی تھی۔ مشرقی علوم و فنون اور زبانوں کو نظر انداز کرنے یا انہیں پس ماندہ اور غیر متعلق باور کرانے کے معنی ان ترجیحات کے تسلط کے تھے جن میں مغائرت کے کئی شائبے اب بھی برقرار تھے۔ اس فصل کو دور کرنے اور زیادہ سے زیادہ یکجائیت INTIMACY کی راہ ہموار کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اقرار و قبولیت سے نئی منزلیں سر کی جائیں۔ ادب و لسان کی تاریخ پر آزاد کی گہری نظر تھی۔ کچھ تو سرسید کی تحریک نے بالواسطہ انہیں بعض مقاصد

کا احساس دلا دیا تھا اور کچھ ڈاکٹر لائٹز کی صحبتوں نے ان کی ایک مختلف نہج پر ذہن سازی کی تھی۔ انجمن پنجاب کے مختلف جلسوں میں پڑھے گئے 144 مقالات میں سے 22 مقالات آزاد ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ آزاد کی گہری علمی اور عملی وابستگی کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی ان کا تقرر لیکچرر کے عہدے پر کر دیا گیا۔ آزاد اسی منصب کے لائق بھی تھے۔

☆

آزاد اپنی نثری تحریروں میں جتنے رومانی، خواب پرست اور اسلوب کے پرستار دکھائی دیتے ہیں۔ انجمن پنجاب کے روزمرہ کاموں، رودادوں کی تیاری اور مختلف منصوبوں کی عمل آوری میں اتنے ہی فعال بھی تھے۔ انجمن میں پیش کردہ مقالات میں بھی زبان سے زیادہ مقاصد پر ان کی نظر تھی۔ ڈاکٹر لائٹز کے بہت سے ادبی اور سماجی اصلاحات کے پروگراموں میں ایک تجویز بچوں کے نصاب کی تیاری سے متعلق تھی۔ لائٹز [1] کا یہ خواب آزاد کے تعاون کے بغیر شرمندہ تعبیر ہونا مشکل تھا۔ آزاد ہی نے یہ بھی سجھایا کہ اس عمل کو کس طریقے اور کس ترتیب کے ساتھ بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ کسی بھی منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے ترجیحات کے تعین کی حیثیت کلیدی ہوتی ہے جس کا خاکہ آزاد نے بنایا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی کمی بچوں کے ادب کی تھی، آزاد نے اپنی معروضیت کے جوہر کا یہاں بھی ثبوت فراہم کیا انہوں نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی درجات کے نصاب تیار کیے بلکہ بچوں کی زبان میں ایسی نظمیں بھی لکھیں جو بچوں کے لیے دلچسپ بھی تھیں اور اخلاق آموز

---

[1] لیکن ڈاکٹر لائٹز کے اردگرد بعض ایسے افراد بھی تھے جنہیں آزاد کی فرض شناسی اور ڈاکٹر لائٹز کی نظر میں ان کی قدر و منزلت گوارہ نہ تھی۔ اس طرح کے لوگ اکثر ان کے کان بھرا کرتے تھے۔ آزاد کو ان کی پرواہ بھی نہیں تھی، پرواہ تھی لائٹز کی جنہیں وہ اپنا محسن کہا کرتے تھے اور جن کی رفاقتیں انہیں دل و جان سے عزیز تھیں۔ ڈاکٹر لائٹز کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر آپ دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں۔ کیوں کہ میرا فخر تنخواہ، کرسی اور عہدے پر نہیں ہے۔ اسی خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا وہ افسوس کرے گا، میرے دل میں جتنے زخم لگے ہیں مجھے عزیز ہیں کہ آپ نے لگائے ہیں۔''

بھی۔ ان تین چار برسوں میں آزاد نے اپنی جو اہلیت دکھائی اس کی کوئی اور نظیر ملنا مشکل تھا۔ ان کے ترغیب دینے کے عمل میں جو یک سوئی اور استقرار تھا، اسے سب ہی محسوس کرتے تھے، غالباً انہیں وجوہ سے 1870ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں معاون پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔

☆

انجمن پنجاب کے سکریٹری ہونے کے بعد انہوں نے ایک کلکتہ کا سفر کیا تھا، دوسرا وسط ایشیا کا۔ پہلا سفر تعلیمی اور تہذیبی نوعیت کا تھا۔ ڈاکٹر لائٹز کے ایما پر وہ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ ان کا مقصد 'محمڈن لٹریری سوسائٹی' (کلکتہ) کے کارکردگی کے طریقوں کی بنیاد پر ایک لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ یہ سوسائٹی ملک میں اپنی نوعیت کی واحد سوسائٹی تھی۔ جس کا قیام 1863ء میں عمل میں آیا تھا اور جس نے کم سے کم وقت میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس نے مسلمانوں میں اپنا ایک حلقہ اثر قائم کر لیا تھا، اسے اس وسیع سطح پر مخالفتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس کا تجربہ بعد ازاں سرسید کو ہوا۔ سوسائٹی کا بنیاد گزار کوئی انگریز افسر بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے نظام العمل کی تشکیل میں کسی انگریز ذہن کی کارفرمائی تھی۔ اس کے بانی نواب عبداللطیف تھے، جنہوں نے ماضی کی غفلت شعاری، حال کی ذہنی اور نفسیاتی پسپائی اور مستقبل کے اندیشوں اور خطرات کے تناظر میں رفع داد باہمی کے اصول پر بنائے ترجیح رکھی تھی اور یہ سمجھایا تھا کہ فی زمانہ تعدیل ومفاہمت کی راہ ہی سب سے امکان افزا، امید افزا اور خیر افزا ہے۔ نئے تہذیبی تقاضوں سے عدم فہمی کئی نئے پسپائیوں کے دہانے ہم پر کھول دے گی۔ آزاد نے اس انجمن کے اطلاق کے طریقوں اور ذہنوں کے متوجہ کرنے کے اسالیب کا گہرے غور وخوض سے مطالعہ کیا اور ایک تفصیلی تجزیاتی رپورٹ بھی تیار کر کے ڈاکٹر لائٹز کے سپرد کی۔

دوسرے وسطِ ایشیا کے سفر کی نوعیت سیاسی تھی، جو ایک خفیہ مشن بھی تھا لیکن آزاد نے اسے ادبی شکل بھی دے دی تھی۔ اس کی سربراہی پنڈت من پھول کے ذمے تھی۔ ڈاکٹر محمد

صادق نے اس سفر کی سیاسی نوعیت پر وضاحت کے ساتھ لکھتے ہوئے جو نتیجہ اخذ کیا، اس کی اہمیت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے کہ 'سیاسی مشن شاید ہی ایسا ہوگا جو ادبی لحاظ سے اس قدر مفید ثابت ہوا ہو' سخن دانِ فارس' جس میں آزاد نے وسطِ ایشیا کے مشاہدات قلم بند کیے ہیں۔ گزشتہ صدی کی چند جان دار کتابوں میں سے ایک ہے'۔

آزاد کے لیے یہ مشن ایک اور طرح بھی مفید ثابت ہوا۔ اس سے وہ غرض بھی پوری ہوگئی جس کے پیش نظر وہ انجمن پنجاب سے وابستہ ہوئے تھے اور اس کی کارروائیوں میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ غدر کے زمانے سے ان کی شخصیت شکوک وشبہات سے گھری ہوئی تھی۔ اب جبکہ انہوں نے ایسی خدمات سرانجام دیں تو ان کی ساکھ حکومت کی نظروں میں پوری طرح بحال ہوگئی اور غدر کے اثرات کا جو خوف ان پر تقریباً دس سال سے مسلط تھا، اب دور ہوگیا۔

تیسرا سفر انہوں نے 1885ء میں کیا تھا۔ انہوں نے اکثر جگہوں پر ایران کی ادبی سیاحت کی شدید خواہش کا ذکر کیا ہے۔ اس سفر میں انہیں کئی قسم کی مشکلات کا سامنا ہوا۔ پیسے کی کمی نے ان مشکلات میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ایران اور اس کا ادب ان کی جستجوؤں کے خاص مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس ایران اور اس کے اساتین ادب کے متعلقات (درگاہ وعمارات وغیرہ) کو بہ نفس نفیس دیکھنے کے خواہاں تھے جن کی جھلکیاں انہوں نے صرف کتابی اقلیم میں دیکھی تھیں۔ ان کا یہ ایک بلند کوش خواب تھا، جس کی تعبیر کے تعاقب میں ان کے بہت سے بھرم چکنا چور ہوئے، کہیں بڑی آسودگی اور عافیت کے سامان میسر آئے۔ کہیں کسی عارضے نے آدبوچا، کبھی کسی حادثے کے شکار ہوئے۔ کتابوں کا بھاری بوجھ ایک 56 سالہ بدنِ لاغر پر ڈال کر قصبہ در قصبہ، شہر در شہر مسافتیں طے کرنے کا جو حوصلہ ان میں کارفرما تھا۔ اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

☆

اس سفر کے بعد بھی وہ تقریباً 1890ء تک اپنی ناتمام کتابوں پر مسلسل کام کرتے

رہے۔ ملازمت کی مصروفیتوں اور انہیں ذمہ داری کے ساتھ نبھانے کے باعث ان کی کئی کتابیں ادھوری پڑی ہوئی تھیں' سیر ایران' بھی انہیں مکمل کرنا تھی۔ جسے بہت بعد میں آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد نے ترتیب دیا اور جو اس رسالے اور اس لیکچر پر مشتمل ہے جسے آزاد نے ایران سے واپسی پر 24 جولائی 1886ء کو انجمن ہال میں دیا تھا۔

اگرچہ آزاد نے 80 برس کی عمر پائی تھی۔ لیکن آخری بیس برس عالم دیوانگی کی نذر ہو گئے۔ اس حالت میں بھی وہ اپنی کتابوں کے اندوختے اور نامکمل کتابوں کے پرزوں اور فائلوں کی نگہداشت[1] میں لگے رہتے۔ نہ کھانے کی سدھ نہ پہناؤں کی فکر، نہ گردوغبار کا احساس، کبھی کسی پر غصہ نکالا، کبھی معذرت کر لی، کبھی کسی کو پہچانا، کبھی نہ جان سکے۔ ایک ایسا شخص جس کے پائے استقامت ہزار طرح کی آزمائشوں میں بھی نہیں لڑکھڑائے تھے، جسے اپنے معمولات میں نفاست عزیز تھی، اب ایک ایسے روزمرہ پر تکیہ کیے تھا، جس میں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے کا فرق مٹ گیا تھا۔ اسی دنیا و مافیہا سے یک گونہ بے خبری کے عالم میں 1910ء میں وہ اس دار فانی سے ایک ایسی اسرار آگیں سیاحت پر نکل گئے، جس کے تجربات سے پہلے کی مسافتوں کی طرح ہم کبھی مستفیض نہیں ہو سکیں گے۔

---

[1] ایک مکتوب میں انہوں نے خود اپنی اس کیفیت کے جواز پر ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے:
''رات کو بالکل کچھ نہیں پڑھ سکتا۔ آزاد بڈھا ہو گیا اور صدماتِ زمانہ نے اسے توڑ دیا، اپنے مسودے بستوں میں بندھے پڑے ہیں۔ دیکھتا ہوں، اور ترستا ہوں۔''

ادب نامہ

قصص ہند

'قصص ہند' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ماسٹر پیارے لال آشوب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ حصہ سوم 1875 میں شائع ہوا تھا، جسے کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب کے حکم سے سررشتۂ تعلیم پنجاب کے اراکین نے ترتیب دیا تھا۔ اس حصے کا قضیۂ مصنف بھی تحقیق طلب ہے۔ قصص ہند کا حصہ دوم محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔ جس کی اشاعت غالباً 1868 میں عمل میں آئی۔ اس حصے کو بھی کرنل ہالرائڈ کے حکم سے نصاب کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ آزاد کو تاریخ اور تاریخی شخصیات اور ان کے سوانح سے خاص دلچسپی تھی اور طلبا کی ذہنی سطح کے مطابق وہ اس سے قبل کئی کتابچے لکھ چکے تھے۔ اسی بنا پر کرنل ہالرائیڈ نے قصص ہند کے حصہ دوم کی تصنیف کا کام بھی انہیں کو تفویض کیا۔ قصص ہند میں کسی خاص عہد یا ہندوستان کی مکمل ومبسوط تاریخ کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے بلکہ محض ان چیدہ چیدہ تاریخی شخصیات ہی پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ جو مختلف وجوہ سے توجہ طلب رہی ہیں۔ آزاد نے انہیں بڑی بے تکلف اور حکائی زبان میں ادا کرنے کی سعی کی ہے۔ آزاد نے بڑی حد تک معروضیت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ یعنی اس رومانیت کو مانع نہیں آنے دیا ہے۔ جسے ان کے لاشعور کے خاص کردار کی حیثیت حاصل ہے۔ پنڈت برج موہن وتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔

> ''میدانِ سخن ایک سبحانی فضا ہے۔ جس میں دیر وحرم، گبر ومسلمان، شیخ وبرہمن سب برابر ہیں۔ قصص ہند میں جابجا اس کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ جس مفرحانہ گرم جوشی اور دلسوزی سے آپ (آزاد) نے قصص ہند میں رانی پدمنی کا باب لکھا ہے۔ اس کی مثال النادر کالمعدوم ہے..... شاہ جہاں کے

مہتابی جشن، پرتھی راج کا جلوس، دکن کی مہم پر عالمگیر کے لشکر کی چڑھائی اور کئی باب اس کتاب میں ایسے ہیں جو اردو نثر کے مجموعۂ انتخاب میں کرسی صدارت پر جگہ دینے کے مستحق ہیں۔''[1]

☆

'قصص ہند' میں محمود غزنوی اور اس کے خاندان، شہاب الدین غوری، علاء الدین اور پدمنی، ظہیر الدین بابر، ہمایوں، اکبر، نور جہاں، شاہ جہاں، اورنگ زیب، شیواجی اور محمد شاہ کے علاوہ گرونانک کے فقر واستغنا، صلح کل نیز فلسفۂ توحید کے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے گرو گوبند سنگھ کے بعد ان حالات کا بھی معروضی سطح پر جائزہ لیا ہے جن میں شمشیر وسناں نے اول کی صورت اختیار کر لی تھی۔ محمود غزنوی، علاؤالدین خلجی، شیواجی اور گرونانک کے بارے میں آزاد نے نسبتاً جذباتیت سے گریز کی راہ اختیار کی ہے نیز اپنے سخن خاص کے اس محاورے سے بھی اپنی تحریر کو محفوظ رکھا ہے جس کے تحت بالعموم متن ومقصد پر عبارت آرائی کا جادو حاوی ہو جاتا ہے۔ دربار اکبری اور سخنِ دانِ فارس کے مقابلے میں قصص ہند میں شکوہِ الفاظ، چستی بندش، استعاراتی آرائش وزیبائش اور جملوں میں اس توازن کی قدر نے بھی کم جگہ پائی ہے۔ جو زور بیان پیدا کرنے کی ایک مجرب کلید کا حکم رکھتی ہے۔ مثلاً محمود غزنوی کے باب میں درج ذیل اقتباس دیکھیں:

''تمام رات بہادروں نے ہتھیاروں کی تیاری میں کاٹی۔ جب پچھلے پہر رات باقی رہی تو تاروں کے پہرہ دار اپنے اپنے پہروں پر قائم تھے، جو محمود نے وضو کر کے دوگانہ نماز کا ادا کیا، سلاحِ جنگ زیبِ بدن کرتے ہی سواری کا حکم دیا۔

ادھر صبح کی سفیدی مشرق سے نمودار ہوئی، ادھر سرخ پھریرا نشانِ جنگ کا ہوا میں لہرایا۔ جب سپہ سالار کو تیسرا حکم پہنچا تو اس نے خود کرنا ہاتھ میں لے کر منہ پر رکھی اور جس طرف سے کہ دھاوے کا موقع تھا،

---

[1] شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی ''قصص ہند''، مجلسِ ترقی ادب لاہور، سن اشاعت درج نہیں صفحہ ع تا ف

ادھر سے پہلو دے کر دوسرے رُخ سے لڑائی ڈالی۔''[1]

ایک دوسری جگہ اورنگ زیب کے لڑکپن کے ایک واقعے کو آزاد ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''عالمگیر کی چودہ برس کی عمر تھی اور گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ اتفاقاً ایک ہاتھی بھاگا اور جدھر یہ کھڑا تھا ادھر ہی آیا۔ سب بھاگ گئے، مگر یہ اسی طرح اڑا رہا اور جب ہاتھی حملہ کر کے آیا تو ایک برچھا کان پر مارا کہ سر میں غرق ہو گیا۔ ہاتھی نے چاہا کہ گھوڑے کو سونڈ میں لپیٹ کر دے مارے۔ گھوڑا اس طرح چمکا کہ یہ پشت سے گرا اور پھر اٹھ کر تلوار سونت، ایک ہاتھ سونڈ پر مارا۔ اس عرصے میں اور جاں نثار آ پہنچے اور ہاتھی بھاگ گیا۔''[2]

محولہ بالا عبارت میں آزاد نے بیانیہ کے فن کو آزمایا ہے۔ یہ جوہر ان کی ہر اس تحریر کو ایک حرکی منظر نامے میں بدل دیتا ہے۔ جہاں ان کی تاکید تاریخی وقوعوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو عمل کی صورت میں کر کے دکھانے پر بھی ہوتی ہے۔ اسی وضع کو انہوں نے تاریخی و نیم تاریخی اور ادبی شخصیات کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں برقرار رکھا ہے۔ آزاد کے لئے تاریخ یا تاریخی واقعات طبعاً بڑے کشش آور تھے۔ لیکن وہ اس درجے کے مورخ نہیں تھے جنہیں محقق کا درجہ بھی دیا جائے۔ تاریخ اور بالخصوص تاریخِ ماضیہ ہمیشہ تخلیقی ذہنوں کے لئے ایک مسلسل سرچشمہ فیضان و وجدان رہا ہے۔ آزاد کی ذہنی ساخت کی تعمیر میں بھی افسانویت کا خاص دخل تھا، جس نے ایک مستقل میلان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ انہیں محض تاریخی یا ادبی شخصیات ہی نہیں تمثیلی کرداروں کی مرقع کشی اور حتی الوسع ایک ایک جز کی تفصیل بیان کرنے اور قاری کی حیرتوں کو ابھارنے اور تجسس کو برقرار رکھنے نیز ایک ایسی فضا تیار کرنے میں بے حد لطف

---

[1] شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی ''قصص ہند''، مجلسِ ترقی ادب لاہور، سن اشاعت درج نہیں صفحہ 13

[2] شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی ''قصص ہند''، مجلسِ ترقی ادب لاہور، سن اشاعت درج نہیں صفحہ 143

آتا ہے جو سحر و حظ کے تمام سامانوں سے مزین ہوتی ہے۔ اسی باعث تصدیق و توثیق کے لئے ذہنوں کو کم ہی اکساتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد صادق (پاکستان) کی درج ذیل رائے سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ وہ لکھتے ہیں:

''جس (قصص ہند) کا موضوع و اسلوب دونوں غیر معمولی ہیں۔ آزاد نے یہ قصے کچھ اس طرح بیان کئے ہیں۔ جیسے وہ ان واقعات سے خود گزرے ہیں۔ کہانی کس طرح آہستہ آہستہ، چپکے چپکے خود بخود بے ساختگی سے آگے بڑھتی ہے۔ اگلے وقتوں کی عجیب و غریب فضا، انسانی فطرت کی سچی عکاسی، قصے کا قدرتی ارتقا، شگفتہ اور غیر ضروری آرائش سے پاک عبارت، یہ باتیں 'قصصِ ہند' کو اردو میں منفرد تصنیف بنا دیتی ہیں۔ آزاد کا لاابالی تخیل جوان کی دوسری تصنیفات میں خلل انداز ہوتا ہے، یہاں اعتدال اور ضبط سے بروئے کار آیا ہے۔ یہی سلجھا ہوا تخیل ہے جس نے اس کتاب کو فی حیثیت سے اتنا وقیع بنا دیا ہے۔''[1]

---

[1] ڈاکٹر محمد صادق (پاکستان) 'محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار' لاہور 1976 صفحہ 161

سخن دانِ فارس

آبِ حیات کے بعد آزاد کی جن تصانیف کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جن کے متون پر انہوں نے بڑی توجہ اور دلجمعی کے ساتھ خاصا وقت اور محنت صرف کی تھی، 'سخن دانِ فارس' ان میں سے ایک ہے۔ آزاد کو علم لسان سے بے حد رغبت تھی، بالخصوص مختلف زبانوں کے مابین افتراق و اتفاق کی نوعتیں ان کے مشکل پسند ذہن پر مہمیز کا کام کرتی تھیں۔ تحقیق کی طرف وہ ایک خاص میلان بھی رکھتے تھے۔ ابھی نہ تو لسانیات کی ان مبادیات ہی سے ہماری آگاہیاں پوری طرح مستفید ہوئی تھیں، جن کے باعث زبانوں کے علم کی ایک علیحدہ تخصیص قائم کی جاتی ہے نہ ہی تحقیق کے سائنسی طریق ہائے کار سے کوئی واقفیت تھی اور نہ ہی وہ وسائل مہیا تھے، جن کی بنیاد پر نیز جدید طرزوں کے مطابق دلائل قائم کئے جاسکیں اور درجۂ استناد کا تعین کیا جاسکے۔

حوالۂ بالا صورت حالات میں آزاد نے سخن دانِ فارس، کا ڈول ڈالا۔ سخن دان فارس کے تمہیدی کلمات سے دو امور پر بالخصوص روشنی پڑتی ہے۔

1- یہ تمہید 5/اگست 1887 کی لکھی ہوئی ہے۔ جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ سخن دان فارس کی پہلی اشاعت کا سال بھی غالباً یہی ہے۔

2- برسوں تک یہ ایک مسودے کی صورت میں دھول کھاتی رہی۔ دوسری بہت سی مصروفیتوں کی وجہ سے اطمینان بخش حد تک آزاد نظر ثانی بھی نہیں کر سکے۔

☆

'سخن دانِ فارس' کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں فلالوجی کی تعریف بیان کرتے ہوئے اظہار مراتب کے تحت اشارات، تقریر اور تحریر کے عمل پر بالترتیب بحث کی ہے اور

اس سوال کا جواب فراہم کیا ہے کہ زبان کیوں کر پیدا ہوئی ؟ زبان ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتی۔ نت نئے الفاظ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ مرتے بھی ہیں اور ان کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں بلکہ معانی بھی کبھی یکساں طور پر قائم نہیں ہوتے۔ بالخصوص جب کسی خاص تہذیبی، جغرافیائی اور معاشرتی منطقے سے نکل کر وہ کسی دوسرے تہذیبی اور جغرافیائی منطقے کی راہ لیتے ہیں اور نئی سرزمینوں پر ان کا تصادم اور اختلاط دوسری زبانوں سے ہوتا ہے تو اس طرح کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ آزاد نے ہر بحث کے دوران ژند، دری، فارسی، عربی اور سنسکرت جیسی زبانوں کے الفاظ ان کی بدلتی ہوئی ہیئتوں، ان کے اشتقاقات اور معانی کی نوعیتوں وغیرہ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ سنسکرت اور فارسی کے متحد الاصل الفاظ پر بحث کرتے ہوئے ان اصولوں کی بھی نشاندہی کی ہے جن کے بموجب ان میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ آزاد کی تحقیقات اور تصورات میں آزاد کے علم کے ساتھ ساتھ ان کی بصیرت، ان کے قیاس اور ان کے تخیل کی جولانیوں کی کارفرمائی بھی شامل ہے۔ آج لسانیات کا دائرہ خاصا وسیع ہو چکا ہے۔ زبانوں کی پیدائش ان کے باہمی رشتوں یا ان کے خاندان جیسے مباحث کو اب کم ہی موضوع بنایا جاتا ہے۔ معنیات و معنویات کے بعد ساختیات اور پس ساختیات نے زبان اور ذہن انسانی کے رشتوں کی جو ایک نئی مابعد الطبیعیات تلاش کی ہے۔ اس کے معنی کی دنیا ہی الگ ہے۔ جو جتنی حقیقت آفریں ہے اتنی ہی رومانی بھی ہے لیکن یہ رومانیت آزاد کی رومانیت سے ایک مختلف پیرایۂ استدلال کی حامل ہے۔ باوجود اس کے سخن دانِ فارس کی جو ایک تاریخی اور حوالجاتی اہمیت ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ اسی ضمن میں محمد حسن لکھتے ہیں۔

> ''سخن دانِ فارس، علم لسانیات پر اردو کی اولین تصانیف میں ہے۔ بلاشبہ آج کے دور میں علم لسانیات کے جو اصول وضوابط ہیں وہ آزاد کے زمانے سے بہت مختلف ہیں، لیکن ایک ایسے دور میں جب یہ علم نیا نیا تھا اور اردو میں علمی موضوعات و مسائل کی طرف بہت کم توجہ کی گئی تھی اس کتاب کی حیثیت کارنامے سے کم نہیں۔ آزاد اردو کے پہلے محقق تھے جس نے

اردو اور فارسی کے لسانی رشتوں کی طرف توجہ دلائی۔ یہی نہیں انہوں نے قدیم فارسی اور قدیم سنسکرت کے لسانی رشتوں پر بھی زور دیا اور یہ ثابت کیا کہ اردو کی لسانی وراثت میں صرف فارسی ہی کا نہیں بلکہ قدیم سنسکرت کے ذخیروں کا بھی بڑا حصہ ہے۔''[1]

'سخن دانِ فارس' کا حصہ دوم گیارہ لیکچروں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں فارس قدیم کی تاریخ، فارسی سے قبل زبانوں کی تاریخ، مسلمانوں کے ورود کے بعد فارسی زبان وادب اور تہذیبی زندگی میں انقلابی تبدیلیوں، فارسی اور عربی کے ربط واختلاط اور اس کے بعد ہندوستانی فارسی اور مختصراً فارسی شاعری کی چیدہ چیدہ مثالوں کو بنیاد بنا کر مختلف نوعیت کی بیش بہا معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

☆

آزاد نے روزہ مرہ استعمال میں آنے والی زبان اور غیر اہل زبان (کی کتابی زبان) کے فرق کی بھی جابجا نشاندہی کی ہے۔ ایک جگہ اردو (ہندی) اور فارسی اہلِ اردو محاورہ کے روزمرہ کے فرق پر وہ ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

''یہ تصویریں تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟'' ہم ترجمہ کردیں گے۔'' ایں تصویر ہا پیش شما از کجا آمدند؟'' ایرانی کہے گا۔'' ایں تصویر ہارا از کجایافتید'؟'' تمہیں ان میں سے کون سی چاہیے؟'' ہندی کہتا ہے'' شمارا ازیں تصویر ہا کدام تصویر درکار است'' اہلِ زبان کہے گا۔'' شما کدامش می خواہید؟''

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:

''کوئی۔ اردو میں انسان اور غیر انسان دونوں کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ'' میں گیا تھا وہاں کوئی نہ تھا'' اور بیمار کہتا ہے۔ کوئی چیز بھلی نہیں لگتی۔ فارسی میں انسان کے لئے کس یا کسے کہتے ہیں۔ غیر کے

---

1. محمد حسن دیباچہ 'سخن دان فارس' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1979

لئے ہیچ یای کافی ہوتی ہے۔ جنہیں یہ نکتہ زبان پر چڑھا ہوا نہیں وہ دونوں موقع پر کس یا کسے بول جاتے ہیں۔ چنانچہ کہیں گے۔ بندہ رفتہ بودم آنجا کس نبود یا ہیچ کس نبود یا کسے نبود۔ اور دوسرے فقرے کا بھی وہی ترجمہ کردیں گے کہ کسے چیز خوشم نمے آید۔ اگر بجائے اس کے کہتے۔ ہیچ چیز خوشم نمے آید۔ چیزے خوشم نمے آید۔ چیزے بمذاقم خوش نمے آید۔ تو محاورہ درست ہوتا۔''[1]

آزاد کو مرقع نگاری، واقعہ نگاری اور تاریخ کو بیانیہ کا رنگ دینے میں خاص لطف آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'سخن دانِ فارس' کو آج بھی اگر کوئی ورق گردانی کے لئے اٹھاتا ہے تو اول تا آخر پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق (پاکستان) نے اپنی ایک جچی تلی رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

''کوئی سیاسی مشن شاید ہی ایسا ہوگا جو ادبی لحاظ سے اس قدر مفید ثابت ہوا ہو۔ سخن دان فارس جس میں آزاد نے وسطِ ایشیا کے مشاہدات قلم بند کئے ہیں۔ گزشتہ صدی کی چند جان دار کتابوں میں سے ایک ہے۔''[2]

☆

آزاد نے فارسی زبان وادب کے پہلو بہ پہلو ایران کی تہذیبی زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ ان کے ایرانی تاریخ اور جغرافیے کے بھرپور علم کا پتہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق (پاکستان) یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ آزاد اہل ایران کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو لیتے ہیں۔ خواہ ان کا تعلق حال سے ہو یا ماضی سے۔ آب وہوا، موسم، لباس، مذہب وغیرہ اور متعدد مثالیں دے کر واضح کرتے ہیں کہ ان سب عناصر نے فارسی زبان اور ادب پر کیا اثر کیا، لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ 'سخن دانِ فارس' میں جن واقعات اور فارسی روزمرہ کا بیان

---

[1] ایضاً صفحہ 246

[2] ڈاکٹر محمد صادق، ''محمد حسین آزاد۔ احوال وآثار''، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول نومبر 1976 صفحہ 46

ہے، ان کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے 'سخن دانِ فارس' کے مآخذ کے ذیل میں مالکم کی تاریخ ایران کی دو جلدوں کا خصوصی حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے اصل نسخے کے چند اقتباسات کے پہلو بہ پہلو آزاد کے ترجمے کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ جن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ 'سخن دانِ فارس' کے تمام نہ سہی بعض حصے یقیناً ترجمہ ہیں۔ اس ذیل میں ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

> ''آزاد سے تقریباً اسی سال پہلے انگلستان کے سفیر مقیم ایران، مالکم نے تاریخ ایران پر دو ضخیم جلدوں میں ایک نہایت خیال افروز اور پراز معلومات تصنیف مرتب کی تھی۔ 'سخن دانِ فارس' کی ترتیب وتدوین کے وقت یہ تاریخ آزاد کے پیش نظر تھی اور ایران کے بارے میں ان کے بہت سے اہم بیانات اسی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔''

نگارستانِ فارس

نگارستانِ فارس بھی آزاد کی وفات کے بعد 1922ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مہتمم بھی آغا محمد طاہر (نبیرۂ آزاد) تھے۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اُس وقت آزاد کی انشا پردازی کا ابتدائی زمانہ تھا اور ان پر فارسی صرف ونحو کا اثر زیادہ تھا؟ سالِ تصنیف کے بارے میں بھی کوئی داخلی یا خارجی شہادت دستیاب نہ ہونے کی صورت میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ جو بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ 'آزاد نے اسے سیاحتِ وسطِ ایشیا سے واپسی پر لکھا' کیونکہ اس میں سفر سے متعلق بعض اشارات ہیں۔ طرزِ تحریر کی نومشقی اور مذکورہ بالا شہادت کی بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب اور ''آبِ حیات'' کی تصنیف کے درمیان کافی عرصہ حائل ہے اور یہ سیاحتِ وسطِ ایشیا سے واپسی کے سال (1866ء) اور ''سخن دانِ فارس'' کی تصنیف کے (1872-74ء) کے درمیان کسی وقت لکھی گئی۔ [1]

☆

ایک طرف عہد آزاد انتہائی انتشار آگیں تھا۔ دوسرے خود ان کی زندگی اور ان کے اہل خاندان کو کئی کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ تس پر کفالت کا مسئلہ، جسے حل کرنے کے لئے انہیں بڑی سخت محنت کرنی پڑی۔ ایسے غیر یقینی اور حوصلہ شکن حالات میں بھی ''قلم ان کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھا۔ ان کے ذہن میں اپنے مقاصد کا جو منصوبہ تھا، وہ خاصہ طویل تھا۔ وہ بہ یک وقت کئی مقاصد لے کر چلے تھے اس لئے کسی ایک

---

[1] ڈاکٹر محمد صادق (پاکستان) محمد حسین آزاد۔ احوال وآثار، مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول 1976

مقصد کے لئے بھی منصوبہ بند وقت کا تعین نہیں کر سکے۔ ان کی وہ تمام تصانیف جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں، اسی باعث تاخیر کا شکار ہوئیں اور ان کی ترتیب وتدوین میں کافی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

☆

''نگارستانِ فارس'' اصلاً فارسی شعرا کا ایک تذکرہ ہے۔ جس میں ان کمیوں اور خامیوں نے بھی بار پالیا ہے جو اکثر تذکرہ نگاروں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں۔ آبِ حیات ایک تذکرے کی حیثیت سے ''نگارستانِ فارس'' سے کئی درجہ بہتر ہے۔ نگارستان فارس میں شعرالعجم کی طرح فارسی شاعری کی تاریخ بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ تاریخ وار چند منتخب اور قابلِ ذکر شعرا ہی کو مطمحِ نظر رکھا گیا ہے۔ آغا محمد طاہر کو کافی تلاش وجستجو کے بعد جو قلمی مسودہ مختلف بستوں میں سے ملا وہ بھی جگہ جگہ سے مخدوش اور غیر مربوط تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'بعض شعرا کے انتخاب کلام بھی نہ مل سکے۔ کیا جانے حالتِ جذب میں کہاں سے کہاں باندھ دیے، دو تین جلیل القدر شاعر بھی رہ گئے۔ مثلاً عمر خیام، ابنِ یمین وغیرہ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی اس قدر شعرا کسی اردو کے تذکرے میں نہ ملیں گے'۔

سیر ایران

یہ کتاب بھی ان چند تصانیف میں سے ایک ہے جو آزاد کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ سیر ایران کی ترتیب وتدوین بھی آغا محمد طاہر نبیرۂ آزاد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ دراصل اس تہذیبی سفرنامے/روزنامچے کا بیشتر حصہ اس لیکچر پر مبنی ہے جسے آزاد نے ایران سے واپسی پر 24 جولائی 1886ء کو انجمن ہال میں دیا تھا۔ آزاد اپنے بزرگوں کے کتب خانے کو ایک مثالی شکل دینا چاہتے تھے، لیکن کمیاب ونایاب کتابوں کی فراہمی میں کثیر رقم درکار تھی۔ سوانہوں نے سفر ایران کے موقعے کو غنیمت جانا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کتابیں عرب وایران میں سستی ملیں گی۔ ان کے مقاصد کی فہرست میں فارسی کی جامع اللغات کا ایک بلند کوش کام بھی تھا۔ جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ایران کے سفر کے بغیر اسے تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ [1]

☆

آزاد 23 ستمبر 1885ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور براہ کراچی 12 اکتوبر کو بوشہر (ایران) پہنچے۔ ایک بڑا مقصد لے کر چلے تھے سو دوران سفر ٹھہرنے کی جگہوں اور کھانے پینے میں کفایت برتتے رہے۔ اور راہ کی تمام صعوبتوں کو اپنے لئے آسان بناتے رہے۔ جس جہانِ دیگر کے تصور سے انہوں نے اپنا ایک حیرت آباد تمنا خلق کر رکھا تھا۔ ایک حقیقت کے طور پر ان کے سامنے واقع تھا۔ وہ مورخ نہیں تھے محض ادب

---

[1] مجھے اس سفر میں بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور اس سے زیادہ یہ خیال کہ جامع اللغات فارسی کے لئے سرمایہ جمع کروں، چنانچہ وہاں کے صاحب علم وفضل کے حضور میں پہنچا۔ انہوں نے کتب خانۂ آزاد کے لئے دو دو نسخے کتابوں کے دیئے۔

وتہذیب کے ایک سفیر تھے۔ جو حافظ وسعدی کے سرچشموں سے اپنی مدتوں کی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔ کہیں ان کے بھرم ٹوٹے، کہیں ان کی توقعات کو زبردست صدمہ پہنچا اور کہیں انہیں سیرابی میسر آئی۔ کتابوں کے ایران کی ایک الگ دنیا تھی، فارسی ادب نے جس تہذیبی منطقے کا نقشہ کھینچا تھا وہ ایک خوش خواب کی طرح آزاد کے نہاں خانۂ ذہن کو زینت بخش رہا تھا۔ اب صورت کچھ اور تھی۔ ماضی کا سارا شکوہ، ساری چمک دمک، ساری شور آگینی رخصت ہو چکی تھی۔ شیراز نہ وہ شیراز تھا، نیشاپور نہ وہ نیشاپور، کیا بسطام، کیا ہرات، کیا مشہد اور کیا دامغان ایک خرابے سے دوسرے خرابے تک کی مسافت تھی۔ البتہ اہل ایران کے حسن سلوک سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ سفر کی ساری تکالیف ذہن سے محو ہو گئیں۔ آزاد کے منصوبے میں بوشہر کے بعد شیراز ہی سرفہرست تھا۔ بوشہر تو ایران کا بندرگاہ ہے جہاں اتر کر انہیں از سرنو سامانِ سفر باندھنا تھا۔ کہیں سواری دستیاب ہوئی، کہیں پیدل ہی چلنا پڑا۔ کوئے جاناں کے تصور نے سفر کی تمام صعوبتیں آسان کر دیں۔ جیسے تیسے وہ شیراز پہنچے۔ حافظ وسعدی کا شیراز، تصور کے عین منافی۔ قدیم طرز کے مدارس، قدیم طرز کے نصاب، شہر میں ایسی کوئی چیز نہیں دکھائی دی جس پر وہ اپنے جان ودل لٹاتے۔[1] حافظ اور سعدی کے مزارات پر حاضری دی اور شیراز کو خیرآباد کہہ کر اصفہان کے لئے نکل پڑے۔ شیراز سے اصفہان تک کا راستہ بڑا سرسبز وشاداب تھا۔ اصفہان کے دریا زندہ زود کو دیکھ کر وہ نہال ہو جاتے ہیں۔ تہران کے تہذیبی اداروں اور انجمنوں کا وہ خاص اہمیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ حکومت وقت کی تعریف کرتے ہیں کہ علوم وفنون کے تحفظ اور فروغ کے باب میں اس کی مساعی بے مثال ہیں۔

---

[1] ''شیراز دیکھنے کا ارمان تھا، ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا۔ اللہ اللہ! خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن، جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں۔ اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ میں نے دیکھا اور تعجب کے ساتھ دیکھا۔ کیوں کہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے۔ اس کی رونق وآبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند پرانی مسجدیں اور کہنہ مدرسے گرے پڑے کھڑے ہیں اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کرتے ہیں۔

☆

جب افغانستان پہنچے تو وہاں کے لوگوں کی کم علمی، لاعلمی اور جہالت کے علاوہ تہذیبی انحاط کو دیکھ کر بے حد ملول ہوئے۔ افغانستان کے سیاحتی تجربات ان کے لئے بڑے اذیت ناک تھے۔ لوگ بھی ذہنی طور پر بے حد پس ماندہ واقع ہوئے تھے۔ یہاں بھی انہوں نے صبر وتوکل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے والی کیفیت تھی۔ ایک واقعہ وہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''میرے پاس پکانے کا سامان نہ تھا اس لئے بہت سی روٹیاں پکوا کر ساتھ لے لی تھیں۔ وہ پانچویں دن سڑ گئیں۔ انہیں سکھایا ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا، وہ بھیگ گئیں جہاں موقع ملا پھر پکوائیں اور دس دس پندرہ دن کی سوکھی پانی کے گھونٹوں سے کھائیں۔''

ایک افتاد اس وقت پڑی جب وہ مشہد سے ہرات جارہے تھے۔ اونٹ پر سوار تھے۔ رات کا وقت تھا، سفر کی شدید تکان تھی۔ گہری نیند لگ گئی۔ اس عالم میں اونٹ سے سر کے بل گر پڑے اور ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ اہلِ کارواں نے انہیں اونٹ کی پیٹھ پر رسیوں سے کس کر باندھ دیا تا کہ وہ دوبارہ نہ گر پڑیں۔ سارا سفر بڑی تکلیف کے ساتھ طے ہوا۔ اس واقعے کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ 'سب کو خیال تھا کہ مر کر رہ جائے گا۔ صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رسّا کھولا اور مجھے آواز دی۔ میں نے کہا تو کیستی؟ شتربان نے نام لیا، تجھے گودی سے اتارا اور بستر پر لٹا دیا۔ تین دن عجیب حال رہا۔ کھانسنا بھی دکھ دیتا تھا'۔ یہ ایک بڑا اندوہ ناک حادثہ تھا۔ اسی سبب انہیں ہرات میں تقریباً ایک ماہ آرام کرنا پڑا۔ ہرات کے ایک تجربے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے یہاں ایک ایک دن پہاڑ تھا، سب سے زیادہ تنگ کرنے والی چیز وہاں کے بچے سے لے کر بوڑھے تک کے پیہم سوالات تھے، جن سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو، کس راستے سے آئے ہو۔ غرض ہر نوع کے سوالات۔''

ہرات بھی ایک خرابہ تھا۔ یادر کھنے کی چیز گوہر شاد بیگم کی بنوائی ہوئی وہ عالیشان مسجد تھی، جوفن عمارت سازی کا ایک نادر نمونہ تھی لیکن اب کھنڈر بن چکی تھی۔ آزاد اس کا مشاہدہ کر کے اسی طرح متاثر ہوئے جس طرح اقبال کے لئے مسجد قرطبہ کا تجربہ تھا۔ آزاد اس موقعہ پر سلاطین تیموری اور شہزادگان تیموری کے عہد کی تاریخ کے چند اوراق دہراتے ہیں۔ یہاں مولانا جامی کے مزار کی زیارت کرتے ہیں۔ پھر قندھار کی راہ لے لیتے ہیں۔ یہاں کی چند تلخ یادیں اپنے ساتھ لے کر کوئٹہ اور پھر 24 جولائی 1886ء کو واپس اپنے مقام مستقر یعنی لاہور کی سرزمین پر قدم رنجا ہوتے ہیں۔

☆

ایران کی سیاحت آزاد کے لئے ایک بڑا یادگار تجربہ تھا۔ جو تلخ بھی تھا اور شیریں بھی۔ انہیں کتابیں بھی ملیں اور کچھ مخطوطات بھی۔ فارسی روزمرہ اور محاورہ کا سمعی تجربہ بھی ہوا۔ جو کتابی زبان سے کم ہی میل کھاتا ہے۔ وہاں کی تہذیب، آداب زندگی، افعال واعمال میں شائستگی کو دیکھ کر وہ بے تحاشہ داد دیئے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ دیکھا جائے تو ایران، ایرانی تہذیب، فارسی زبان اور فارسی ادب آزاد کی دلچسپی کے خاص موضوع تھے۔ فارسی ان کی پشتینی زبان تھی، دوسرے یہ کہ ادب ولسان کے اعتبار سے اردو کا تعلق فارسی سے زیادہ گہرا تھا۔ آزاد نے سفر ایران کے دوران اپنی آنکھیں ہی کھلی نہیں رکھیں بلکہ سماعتوں کو بھی پوری طرح وا رکھا۔ کتابوں کے علاوہ فارسی کے اہلِ زبان کی گفتگو سے انہوں نے ایک محقق ایک طالب علم کے طور پر بہت کچھ سیکھا اور حتی الوسع ان تجربات کو کام میں بھی لیتے رہے۔

نیرنگِ خیال

آبِ حیات کے بعد جس تصنیف نے آزاد کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشا وہ نیرنگ خیال ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں آٹھ مضامین کے علاوہ ایک دیباچہ اور ایک ابتدائیہ بھی شامل ہے۔ حصہ اول 1880 میں شائع ہوا۔ حصہ دوم کی اشاعت آزاد کی وفات کے 40 سال بعد یعنی 1923 میں عمل میں آئی۔ جسے نبیرۂ آزاد آغا محمد طاہر نے اپنے ایک دیباچے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

نیرنگ خیال (حصہ اول اور حصہ دوم) کے تمام (13) مضامین درج ذیل انگریزی[1] مضامین کے کہیں لفظی اور کہیں آزاد ترجمہ ہیں۔

1- آغاز آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا:

"AN ALLEGORICAL HISTORY OF REST AND LABOUR" (JOHNSON)

2- سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ:

"TRUTH, FALSEHOOD AND FICTION, ANALLEGORY" (JOHNSON)

3- گلشن امید کی بہار:

"THE GARDEN OF HOPE, A DREAM" (JOHNSON)

4- سیر زندگی:

"THE VOYAGE, OF LIFE"(JOHNSON)

5- انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا:

"THE ENDEAVOUR OF MANKIND TO GET RID OF THEIR BURDENS, A DREAM"(ADDISON)

---

[1] ڈاکٹر محمد صادق، (پاکستان) ''محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار''

6- علوم کی بدنصیبی:

"THE CONDUCT OF PATRONAGE" (JOHNSON)

7- علمیت اور ذکاوت کے مقابلے:

"AN ALLEGORY OF WIT AND LEARNING" (JOHNSON)

8- جنت الحمقا:

"PARADISE OF FOOLS (PARNELL) THE SPECTOR", No,460

9- خوش طبعی:

PUBLISHED IN THE SPECTATOR,No,35. (ADDISON)

10- نکتہ چینی:

"AN ALLEGIRY OF CRITICISM" (JOHNSON)

11- مرقع خوش بیانی:

PUBLISHED IN THE SPECTATOR, NO.63 (ADDISON)

12- سیر عدم:

PUBLISHED IN THE SPECTATOR, NO.501 (ADDISON)

13- شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار:

"VISIONS OF THE TABLES OF FAME" (PUBLISHED IN THE TATLER, NO.81)

ان تراجم کی ایک خوبی یہ ہے کہ ترجمہ، ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ آزاد نے اسے اس طور پر اردو لسانی تہذیب میں ڈھال کر پیش کیا ہے کہ نہ تو فضا کے اعتبار سے کہیں مغربیت نمو پاتی ہے اور نہ ہی آزاد اپنے اسلوب خاص سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ مالک رام کا یہ خیال درست ہے کہ:

> ''نیرنگِ خیال میں جتنے مضامین شامل ہیں۔ یہ دراصل انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین جانسن کے ہیں۔ تین ایڈیشن کے اور بقیہ دوسرے انگریزی ادیبوں کے۔ لیکن ترجموں میں آزاد نے اپنی ذہانت اور سحر بیانی سے اتنا ردوبدل کر دیا ہے کہ ان کا درجہ

ترجمے سے بڑھ کر تخلیق کا ہو گیا ہے۔''[1]

مالک رام کے نزدیک ''نیرنگ خیال'' نہ صرف یہ کہ آزاد کی قادرالکلامی اور انشا پردازی کا ایک نادر نمونہ ہے بلکہ یہ مضامین اردو میں افسانے کے بھی سب سے اولین نقوش ہیں۔ نیرنگ خیال کے حصہ دوم کی ترتیب وتدوین نبیرۂ آزاد آغا محمد طاہر کی مرہون منت ہے۔ آغا محمد طاہر کے دیباچے کو بھی بعض حضرات نے آزاد ہی کی تحریر سمجھ لیا تھا۔ کیوں کہ اس دیباچے میں آغا طاہر نے آزاد کے طرز لسان کی نقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کا عنوان بھی بہ طرز آزاد 'بقائے دوام' رکھا تھا۔

> ''لو وہ وقت آ گیا کہ عدم کی سرحد سے ملے ہوئے افراد زرق برق کی عبارت آرائیوں کا جامہ پہن کر ایفا کی منزلوں میں گشت کریں اور نیرنگ خیال کی دوسری مجلس جس کا وعدہ حضرت آزاد نے آج سے چالیس سال پیشتر کیا تھا اور ہزاروں آنکھیں نگراں تھیں کہ کب وہ گھڑی آئے اور دھوم دھام سے کاغذ کے وسیع چمن میں خیالات کے باسکوپ کے ذریعے مجلس آراستہ کی جائے تو اب دیکھنا کہ بے تار کی برقی کے پیغامبروں نے کس تیزی سے شائقین کو جمع کیا ہے کہ نظر شمار ان کے سمیٹنے سے عاجز آ گئی ہے۔''[2]

محولہ بالا اقتباس فضا سازی کے اعتبار سے کسی حد تک آزاد کے اسلوب خاص کی چغلی ضرور کھا رہا ہے، لیکن آزاد کے طرز گفتار میں جو شکوہ آرائی، جملوں میں جو توازن، مشابہتوں میں جو اختراعی جہت اور استعاروں کا جو برمحل استعمال ملتا ہے۔ اس نقل آرائی سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ آزاد کے اسلوب خاص کی نقل کسی نہ کسی طور پر ایک دو تحریروں کی حد تک تو کی جا سکتی ہے۔ (جو ایک بے حد مشکل کام ہے) اس کے بعد اسے آزاد کی طرح سیکڑوں صفحات تک برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ حیرت کا مقام یہ کہ آب حیات والا آزاد' دربار اکبری' اور سخن دانِ فارس جیسی تصنیفات میں بھی اپنی توفیق کو یکساں

---

[1] [2] محمد حسین آزاد' نیرنگ خیال حصہ دوم' مرتبہ آغا محمد طاہر چمن بک ڈپو اردو بازار، دہلی-1923 صفحہ 6,5۔

طور پر منوالیتا ہے۔حتیٰ کہ نیرنگ خیال کی افسانہ طرازیوں میں اس کی شان تو اور دوبالا ہوجاتی ہے۔

درباب تمثیل: بیان کا ایک طرز:

ادب کو غیر ادب سے جو چیز متمائز کرتی ہے، وہ اس کا راست اسلوب اور اظہار کے وہ طریق ہائے کار ہیں جن کا ادب کی رسومیات سے سیدھا تعلق ہے۔ ادبی تحریروں میں اسالیب کی سطح پر جو تنوع پایا جاتا ہے اسے ہم انفرادی تخیل اور وجدان کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔یعنی تخیل کو وہ سرگرمی جو کسی بھی ادبی تخلیق میں عمومی توقع کے رد پر منتج ہوتی ہے اور جس کی صداقت کو جانچنے کی کوئی بھی خارجی کسوٹی محض ایک حد تک ہی ہماری مدد کرسکتی ہے۔اسے صرف ہمارا وجدان ہی قبولیت بخشتا ہے اور جس سے ہمارے جذبات اور محسوسات کو ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ ادب کے غیر رسمی کردار میں زبان کا تفاعل ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادب میں بالخصوص زبان کے اندر جو تخلیقی صلاحیتیں ہیں انہیں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جو عمومیت کو رد کرتی ہیں۔ ادبی اظہار کے تمام وسائل کا سرچشمہ بھی ہر زبان کی تخلیقی صلاحیت پر مبنی ہے۔ اگر زبان کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو تو تخیل اور وجدان کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ جائیں۔ تمثیل جو یکے از قسمے استعارہ ہی ہے۔ ادبی اسالیبِ اظہار میں خاص وقعت رکھتی ہے۔ یہ ایک قدیم ترین اسلوب اظہار ہے۔ جسے قدیم اور جدید ادبی تحریروں کے علاوہ مذہبی صحیفوں، اساطیری اور مہماتی قصوں ہی میں نہیں بعض علمی اور فلسفیانہ مضامین میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

☆

تمثیل، بیان کا وہ طرز ہے جس میں ایک بات کہہ کر دوسری مراد لی جاتی ہے۔ جسے اشیا کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا ایک طرز خاص بھی کہہ سکتے ہیں۔ تمثیل نگار کسی خیال، حقیقت، واقعے یا تجربے کو من وعن ادا کرنے کے بجائے بہ شکل دیگر ادا کرتا ہے۔ اس قسم کی تحریر میں معنی کی ایک سطح ظاہری ہوتی ہے اور دوسری ضمنی۔ اصل مفہوم وہ نہیں ہوتا جو پہلی سطح

سے مظہر ہے بلکہ پہلی سطح پر نمو پانے والے سارے کردار اور اعمال ایک دوسرے باطنی معنی کو راجع ہوتے ہیں۔ تمثیل نگار مجرد اوصاف یا مجرد تصورات کو مشخص کر کے یا غیر ذی روح اشیا کو ذی روح فرض کر کے مجسم شکل میں پیش کرتا ہے۔ جہاں مرئی کردار یا اشخاص پیش کئے جاتے ہیں، وہاں بھی ان سے مراد کچھ اور ہوتی ہے۔ بعض تمثیل نگاروں نے ذی روح کو غیر ذی روح ملبوس میں بھی پیش کیا ہے۔ اس نوع کی مثالیں بالعموم کسی منظوم یا منثور پارے میں محض ایک جزو کا حکم رکھتی ہیں۔

☆

تمثیل کے ضمن میں یہ ضروری نہیں کہ وہ لازماً اخلاق آموز ہو۔ اخلاقی قصوں کے علاوہ طنزیہ و ہجائیہ نیز سائنسی افسانوی ادب میں اس نوع کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ انگس فلیچر کے نزدیک ادب کے حدود جتنی وسیع ہیں اتنی ہی وسعت تمثیل رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''تمثیلی طرز اظہار ایک غیر معمولی صنف ادب ہے۔ جس میں مخاطراتی و مہماتی قصے، جدید مغربی مثالی، سیاسی، ہجائی ادب، نیم فلسفیانہ تشریحات، باستانی حکایات، مکاشفاتی تصورات، قاموسی رزمیے، وہ ناول جو فطرتیت (نیچرلزم) پر استوار ہیں اور سماجی تبدیلی جن کا مقصد ہے۔ خیالی بحری سفرنامے، جاسوسی اور پریوں کی کہانیوں وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔''

تمثیل ایک توسیعی اور مسلسل استعارے کا حکم رکھتی ہے۔ تشبیہ دو مختلف النوع اشیا میں نقطۂ اشتراک کی دریافت کا نام ہے۔ جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مذکور ہوتے ہیں۔ استعارے میں مشبہ کو مستعار لہٗ اور مشبہ بہ کو مستعار منہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تشبیہ میں جسے ہم وجہ شبہ کا نام دیتے ہیں۔ استعارے میں اسے وجہ جامع سے موسوم کیا جاتا ہے۔ استعارے اور تشبیہ میں یہی فرق ہے کہ استعارے میں مشبہ کو بعینہٖ مشبہ ٹھہرا لیتے ہیں، پروفیسر منظر اعظمی کے لفظوں میں:

> ''دراصل استعارہ اختلاف سے اتحاد کی طرف بڑھتا ہے۔ اس میں

مستعار منہ اور مستعار لہٗ کا باہمی اختلاف پس منظر بن جاتا ہے اور دونوں میں اتحاد بظاہر جزوی اور معمولی نظر آتا ہے، مگر فن کار کے زور دینے اور تاکید کے سبب وہی جزوی اتحاد پھیل کر پورے مفہوم پر غالب آ جاتا ہے اور اس طرح سے ایک کی صفت دوسرے کی نظر آنے لگتی ہے۔ درآں حالیکہ ان میں بہت سے معاملات میں صرف اختلاف ہی نہیں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن استعارے کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ اختلاف اوصاف کو پس منظر میں ڈال دیتا ہے اور ایک معنوی اتحاد پیدا کر کے واضح ذہنی پیکر سامنے کر دیتا ہے۔ مثلاً ''شیر آ رہا ہے'' ظاہر ہے اس جملے میں شیر بہادر آدمی کے لئے استعارہ ہے اور شیر اور آدمی میں بہت سی باتوں میں اختلاف ہی نہیں تناقض بھی پایا جاتا ہے۔''[1]

اکثر تمثیلی قصص، داستان کی طرح بالعموم زمان و مکان کے تعین سے عاری ہوتے ہیں۔ کیوں کہ تمثیلی قصہ دوران محض میں واقع ہوتا ہے (جیسے نیرنگ خیال کے قصے) اسے خارجی وقت کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ تمثیلیہ :FABLE اور مثالیہ :PARABLE میں بھی زمان و مکان کی تخصیص کو روا نہیں رکھا جاتا۔ اساطیری کردار جیسے زیس، اپالو، ڈایونسس، آرفیس اور یوریدس، ہرقل، لکشمی، شیو اور گنیش وغیرہ سے متعلق قصے بھی دورانِ محض ہی میں واقع ہوتے ہیں۔

نیرنگ خیال کا دیباچہ:

نیرنگِ خیال کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد ان مغربی مستشرقین کے ہم نوا ہیں جن کی نظر میں مشرقی اور بالخصوص ہندوستانی علوم و ادبیات کا سارا سرمایہ مغرب کے مقابلے میں حقیر ہے۔ آزاد نئی تہذیب کی اس سواریٔ شاہانہ کا بہ سروچشم خیر مقدم کرتے ہیں جس کے جلو میں نئے نئے علوم اور نئے نئے فنون ہیں۔ جو طلسمات کا درجہ

---

[1] پروفیسر منظر اعظمی ''اردو میں تمثیل نگاری'' انجمن ترقی اردو ہند دہلی، طبع دوم 1992 صفحہ 30,25

رکھتے ہیں اور جنہیں دیکھ کر عقلِ رسا حیران ہے۔ اس کے مقابلے پر اردو جو سبزۂ خودرو کے مماثل ہے۔ اس کی خودروی ہی اس کے بے اصولے پن کا باعث ہے۔ آگے چل کر وہ اسے ایک لاوارث بچے سے موسوم کرتے ہیں۔ جسے شعرا نے پناہ دی۔ شاعری ہی کے مکتب نے اسے جلا بھی بخشی۔ یہاں آزاد یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اردو نثر کا آغاز بہت بعد میں ہوا جو کچھ اصل سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے۔ اسی باعث وہ عملی زبان نہیں بن سکی۔

☆

فارسی اور اردو کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''وہ فارسی کے پروں سے اڑی لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی۔ وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی''۔ یہاں بھی آزاد ایک نوآبادیاتی ذہن ہی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ورنہ اردو زبان وادب کے ارتقا کی کہانی دوسری قدیم وجدید زبانوں سے (حتیٰ کہ مغربی زبانوں سے) مختلف نہیں۔ ہر زبان میں تاریخی اعتبار سے شاعری پہلے واقع ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر زبان میں نثر کے اولین نمونوں پر شعری اسالیب کا اثر حاوی ہے۔ عام طور پر نثر کے ارتقا کو صنعتی دور کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ جب عقلیت ایک مجبوری بن جاتی ہے۔ انیسویں صدی کا سارا تاریخی منظر نامہ بے حد مخدوش اور غیر یقینی تھا۔ یہیں سے خوابوں کے ٹوٹنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ نئے ذہنوں کے لئے محض مشاہدہ ناکافی تھا۔ تجزیے کی ضرورت تھی۔ محض اچٹتی ہوئی سرسری نگاہ، چیز کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی تھی کیوں کہ تعقل اور معروضیت کے بغیر استقلال کی اس صلاحیت کا پیدا ہونا بھی مشکل ہے جس سے حقیقت فہمی کے لئے ایک مناسب فضا تیار ہوتی ہے۔ نثر کے لئے بھی یہی یکسوئی اور معروضیت ایک ناگزیر قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد کا یہ الزام بھی کوئی معنی نہیں رکھتا کہ اردو لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھی۔ اس ضمن میں آزاد کے ذہن میں غالباً بعض قصائد ومراثی کی مثالیں تھیں۔ لیکن انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یہ اصناف جس قدر اپنے موضوعات کے ساتھ مخصوص ہیں وہیں فکر وتخیل کو بے حد آزادیاں بھی فراہم

کرتی ہیں۔ بیان اور بیانیہ کے فنی امتزاج کے لحاظ سے بھی ان کی بڑی وقعت ہے۔لفاظی وہاں واقع ہوتی ہے جہاں ترجیحات محض مترادف اور متضاد لفظی خوشوں اور رعایتوں پر رعایتیں قائم کرنے تک محدود ہو جاتی ہیں۔ان اصناف نے شعری زبان کو وسعت بھی بخشی اور فنی تدابیر کے استعمال کی بہترین مثالیں بھی قائم کیں۔میں قصیدہ کو اسی بنا پر اُمّ الاصنافِ سخن سے موسوم کرتا ہوں کہ دیگر کئی اصناف کے اجزاء واسالیب کا سرچشمہ بھی یہی صنف ہے۔نیز اولیت وقدامت کے لحاظ سے بھی یہ سب پر مرجح ہے۔

☆

آزاد نے استعارہ پرستی کو اردو کے زوال سے تعبیر کیا ہے۔ جب کہ استعارہ تخلیقی ذہن کا بنیادی کلمہ ہے جو حقیقت کو ایک نئے انکشاف میں بدل دیتا ہے۔شاعر چیزوں کو نیا نام دے کر ایک ایسی نامانوس فضا خلق کرتا ہے جسے ایک نئے حیرت آباد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔شعر کا سارا تاثر، سارا جادو اصلاً استعارے ہی کی مرہون ہے۔ستم ظریفی یہ کہ آزاد کی نثر کے سارے لسانی نظام پر استعارے ہی کی حکمرانی ہے۔ان کی نثر وہیں زیادہ کاری اور موثر ہے جہاں وہ استعاروں میں کلام کرتے ہیں۔نیرنگ خیال کی بنیاد ہی استعارہ ہے۔

آزاد اردو کو سبزۂ خودرو مفلس زبان یا لاوارث بچہ کہہ کر ہی بس نہیں کرتے بلکہ اسے ادنیٰ درجے پر فائز قرار دیتے ہیں۔ادبیات کے مفاہیم وموضوعات کا سرمایہ بھی انہیں مایوس کن حد تک محدود دکھائی دیتا ہے۔انگریزی ادب ان کے لے اس بنا پر وقیع تر ہے کہ اس کا اصل اصول یہ ہے کہ ''جو سرگزشت بیان کرے، اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور نثر اس کا دل پر کھٹکے..... حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعتِ خیال اور پروازِ فکر اور تازگیِ مضامین اور طرز بیان کا اندازہ قابل دیکھنے کے ہے''۔ یہاں 'طرز بیان کا انداز، فقرے سے قطعِ نظر آزاد اگر ہماری مثنویوں، مرثیوں، شہر آشوبوں اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے علاوہ تازگی مضامین اور وسعتِ خیال کے اعتبار سے میر تقی میر اور غالب کے کلام ہی پر ہمدردانہ فہم کے ساتھ غور کر لیتے تو انہیں اس طور حاشیہ چڑھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

☆

ظاہر ہے خیال اور عبارت کی رنگینی، فقرہ بہ فقر اور جملہ بہ جملہ بے ساختگی، یکساں نوعیت کی مشابہتوں کی تکرار سے گریز، روانی اور برجستگی کے علاوہ از اول تا آخر متین وسنجیدہ فضا کی برقراری، بیان کے ہر ہر ٹکڑے میں صلابت اور تضبیط کے جوہر کے ساتھ تاثیر اور دلنشینی کو قائم رکھنے کا وہ طرز جس سے آزاد کے اسلوبِ خاص کی تشکیل ہوتی ہے۔ انگریزی کے انشا پردازوں سے کہیں زیادہ موثر اور پُر کار ہے۔ بالخصوص ترجمے میں اپنے اسلوب خاص کے امتیازی عناصر کو قائم رکھنا ایک کاردارد ہے۔ آزاد نے نہ صرف یہ کہ اپنے طرز کے خصائص کو نمایاں رکھا بلکہ اصل متون کے بنیادی مفاہیم کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔

ان تمثیلات میں ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار'' کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ تو ایڈیسن کے مضمون VISION OF THE TABLE OF FAME سے ماخوذ ہے۔ ایڈیسن نے محض مغرب کی ممتاز شخصیات کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں مسند عطا کی تھی، آزاد نے اس دائرے کو مشرق تک پھیلا دیا ہے۔ ان نمایاں ہستیوں میں رام، والمیک، بکرماجیت، راجہ بھوج، کالی داس اور شیواجی کے علاوہ شاہان کیانی اور رستم جیسے نامور پہلوانان ایرانی، فردوسی، نظامی، انوری، خاقانی، ظہیر فارابی، محقق طوسی، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، شیخ بوعلی سینا، افلاطون اور ارسطو اور میر امن سے لے کر سودا اور غالب تک کے نام آتے ہیں۔ شاہان ہند کے علاوہ چنگیز، ہلاکو اور نادر شاہ کا شمار بھی ان منتخب لوگوں میں کیا ہے جن کی شہرت ان کی ہلاکت خیزی اور بشریت کشی کے باعث تھی۔ آزاد نے ہر شخصیت کے بہتر اور کمتر ہر دو پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے کوئی مصور ایک خاص تناسب کے ساتھ ہلکے اور گہرے رنگوں کا استعمال کرتا ہے اور اسی نسبت سے اس کا مقصد ہمارے ذہنوں پر مختلف النوع اثرات مرتب کرنا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آزاد نے بھی بہر مقام اپنے موئے قلم سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی نے بالخصوص اس مضمون کا خاص تاکید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بلاشبہ دربار کی مرقع کشی اور شخصیات کی واقعہ نگاری میں آزاد نے

کمال کر دکھایا ہے۔ اس کے بہت سے اجزا ایسے ہیں کہ جو اردو کی بہترین نثر میں کہیں بھی جگہ پا سکتے ہیں۔ آزاد کے جادو نگار قلم نے ان شخصیات ہی کو نہیں، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو بھی اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ان کے تخیل کی کرشمہ سازی اور ان کی معلومات اور قادر الکلامی پر بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔''[1]

نیرنگ خیال کے ترجمے کے باب میں

آزاد نے ایک سے زیادہ مرتبہ ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین کو ترجمہ[2] کہا ہے، لیکن انہوں نے انگریزی مضامین کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔[3] ممکن ہے ڈاکٹر لائٹز ہی کے توسط سے یہ متون دستیاب ہوئے ہوں اور خود لائٹز نے ان متون کے مآخذ کی نشان دہی نہ کی ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ آزاد کی قادر الکلامی نے اس نواح میں بھی خوب جوہر دکھائے ہیں۔ حتیٰ کہ ترجمے کا کہیں شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آزاد نے جا بجا بڑے مناسب تصرفات سے بھی کام لیا ہے۔ زبان کی روانی کو قائم رکھنے کے لیے وہ اکثر ایسی رعایتوں کا اہتمام بھی بلا تکلف کرتے ہیں، جن سے ان کے اسلوب خاص کی پہچان وابستہ ہے۔ انگریزی کے آٹھ آٹھ سطروں پر مبنی طویل جملوں کو وہ بڑی مشاقی کے ساتھ تین چار جملوں میں ادا کر کے اتنا چست اور رواں بنا دیتے ہیں کہ ان کا سارا بوجھل پن دور ہو جاتا ہے۔ ذیل میں 'آغازِ آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا' کا یہ اقتباس دیکھیں کہ آزاد نے

---

[1] منظر اعظمی ''اردو میں تمثیل نگاری'' دہلی طبع دوم 1992 صفحہ 281

[2] میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنہیں یہاں (اسّے) جواب مضمون کہتے ہیں۔ بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے حوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ (نیرنگ خیال کے ترجموں کی طرف اشارہ ہے۔)
اردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پیا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گزر نہیں، اور یہ سخت دشواری ہے کیوں کہ اگر لکھنے میں تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا۔ اور اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہو گئی نہ کہ رفیق تفریح۔

[3] یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اسے کر دیا۔

کس بے تکلفی کے ساتھ اصل متن کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔

"In the early age of the world, as is well known to those who are versed in ancient traditions, when innocence was yet untainted. and simplicity unadulterated, mankind was happy in the enjoyment of continued pleasure, and constant plenty, under the protection of Rest ; a gentle divinity, who required of her worshippers neither altars nor sacrifices, and whosc rites were only performes by prostrations upon turfs of flowers in shades of jasmine and myrtle, or by dances of the banks of rivers flowing with milk nectar.

Under this easy government the first generation breathes the fragrance of perpetual spring, ate the fruits,which without culture, fell ripe into their hands, and slept under bowers arched by nature, with the birds singing over their heads, and the beasts sporting about them, But by degrees they began to lose their original integrity, Eadh, though there was more than enough for all, was desirous of appropriating part to himself. then entered violence and fraud, and theft and rapine.Soon after pride and envy broke; into the world, and brought with them a new standard of wealth ; for men who till then thought themselves rich when they wanted nothing, now rated their demands, not by the calls of nature, but by the plenty of others ; and begari to consider themselves as poor, when they beheld their own possessions exceeded by those of their neighbours. Now only one eould be happy, because only one could have most, and that one was always in danger, lest the same arts by which he had supplanted others should be practised upon him"

اب آزاد کی وہ تمثیل پڑھیے جس کا عنوان انہوں نے ''آغاز آفرینش میں باغ عالم کا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔'' رکھا ہے:

''سیر کرنے والے گلشن حال کے اور دوربین لگانے والے ماضی
واستقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانے کے پیراہن پر گناہ کا

داغ نہ تھا اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا، تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بے فکری' مدام کے عالم میں بسر کرتی تھی۔ ملک ملک فراغ تھا اور خسرو آرام رحم دل، رشتہ مقام گویا ان کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اس کی اطاعت وفرماں برداری اسی میں ادا ہوجاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے، ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے، آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔ نہ گرمی میں تہہ خانے سجانے پڑتے، نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے، قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑتی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے، وہ شربت سے سوا مزہ، دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی طاقت، قوتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں، رنگا رنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب وہوا، قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ وہ ہزار مقوی اور مفتوح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے۔ جابجا درختوں کے جھرمٹ تھے۔ ان ہی کے سایے میں چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش وآرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں خوشی سے مالا مال اور دل فارغ البال تھے۔

اتفاقاً ایک میدانِ وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا، مگر بواس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں اور ہر ایک کے دل میں خود بہ خود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامان عیش وآرام کا جو کچھ ہے، میرے ہی کام آئے، اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آ کر چالاکیاں دکھانے لگے۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا ان کے ذریات یعنی غارت، تاراج، لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے۔ جب راحت وآرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور، خود پسندی، حسد نے اس باغ میں آ کر قیام کر دیا۔ ان کے اثر صحبت سے یہ لوگ بہت خراب ہوئے، کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے، یعنی عیش وافر اور سامان فراواں، جو کچھ درکار ہو، موجود تھا اور اسی بے احتیاطی کو لوگ تونگری کہتے تھے، پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ، لیکن تونگر ہم جبھی ہوں گے جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اس بے چارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو، مگر انہیں جب ہمسائے خوش حال نظر آتے تھے تو جل جاتے تھے، اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے۔"

محولا بالا اصل متن کے پہلے پیراگراف میں بس یہ کہا گیا تھا کہ: دنیا کے اوائلی عہد کے بارے میں وہ لوگ بخوبی آگاہ تھے جو قدیم روایتوں کا گہرا علم رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نسلِ انسانی ایک باوقار الوہیت کے منصب سے سرافراز عافیت کی دیوی کے زیر سایہ بے کنار حظ اور انبساط میں سرشار رہا کرتی تھی۔ جو اپنے پرستاروں سے کسی قسم کے نذرانے

یا قربانی کی طلب گار نہ تھی۔ یاسمن اور سفید خوشبودار پھولوں کے تختوں پر سجدہ ریزیوں یا مشروب اور شیر کے دریاؤں کے کناروں پر رقص کے ذریعے ہی اس کی اطاعت گزاری کی رسم ادا ہو جاتی تھی۔

اس ترجمہ کردہ متن کا آزاد کے متن سے موازنہ کر کے دیکھیے۔ آزاد کے مقابلے میں اصل متن اور اس کا ترجمہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ آزاد کے تخیل میں جو خلاقی اور پیکر آفرینی کا زبردست مادہ ہے، اس کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ آزاد کی تخلیقی حس مروّجہ نثر کے اس منطقی کردار کے منافی تھی جسے چیزوں کو نیا نام دینے سے نہ تو کوئی مطلب تھا اور نہ ادبیت کے جوہر اور اس کے تقاضوں سے وہ کوئی نسبت رکھتی تھی۔ آزاد اختراع کی زبردست اہلیت رکھتے تھے۔ وہ طبعاً ایک Paganist واقع ہوئے تھے جنہیں شبیہیں وضع کرنے اور جا بجا مشابہتیں قائم کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

آب حیات اور آزاد کا طریق نقد

''حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کا موجودہ دور اس دور کا تسلسل ہے جو ہندوستان کے عام نشاۃ الثانیہ اور علی گڑھ تحریک کی آغوش میں پروان چڑھا۔ اس نے آزاد، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، شبلی اور شرر پیدا کیے جنہوں نے مشرق و مغرب کے بعد کو کم کر کے غور و فکر کے چند بنیادی مفروضات کی جانب متوجہ کیا۔ تاریخ اور معاشی حالات نے ان کے ذہنوں کو یکا یک جست لگانا سکھایا، جس کے فیض سے نئے ادبی اصناف، نئے ادبی تصورات اور نئی ادبی روایتوں کی بنیاد پڑی۔ پھر ان کی کھڑی ہوئی عمارتوں میں ترمیم اور اضافہ کرنے والے پیدا ہوئے ۔جنہوں نے مغربی اثرات کو اولیت دی اور حالی اور آزاد اور شبلی کی تنقیدی اور تحقیق بصیرت پر کڑی تنقیدیں کیں۔ اس طرح نئے بت بنتے رہے، پوجے جاتے اور ٹوٹتے رہے اور یہ عمل آج بھی جاری ہے..... کسی نے آزاد کو افسانہ گو کہا۔ حالانکہ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر نقاد اپنے طریقِ کار میں در پردہ حالی، آزاد اور شبلی ہی کی پیروی کرتے رہے کیوں کہ انہوں نے جس کاوش سے تنقید میں معیاروں کی تلاش کی طرف اشارہ کیا تھا وہی تنقید کا اصل مسئلہ تھا۔''[1]

درحقیقت آزاد اور ان کے معاصرین نے ایک ایسے عبوری دور میں معیار سازی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اپنے اپنے حدود اور میدانوں میں نئے امکانات کی جستجو کو ایک

---

[1] احتشام حسین 'عکس اور آئینے' لکھنؤ 1962ء صفحہ 121-120

مقصد ہی نہیں، ایک مشن کے طور پر اخذ کیا تھا۔ جسے ایک وسیع معنی میں 'تجربے' کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی صنف کی بنیادیں وضع کرنا یا صنفی سطح پر ہیئت و موضوع کے اعتبار سے کوئی نیا تجربہ کرنا، اپنے میں کم خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ تجربے کی ناکامی شاعر و ادیب کی ساری کاوش و کوشش پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہوتی ہے۔ ہر تجربہ کرنے والی نسل کو اس قسم کے خطرات و شبہات سے بہر طور گزرنا ہی پڑتا ہے۔ پس رو نسل ہی ان کی ناکامیوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس طرح ادب کی تاریخ میں تجربات کی ناکامی کے اندر ہی امکانات کی رو بھی تہ نشین ہوتی ہے۔ آزاد، حالی اور شبلی کے مطالعے کے دوران ہمیں اس پہلو کو بھی بالخصوص اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

☆

محمد حسین آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ادبی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو ان کی تنقیدی کارکردگی سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے نظریہ سازی نہیں کی لیکن ان کے خطبات اور دیباچوں کے علاوہ آبِ حیات میں بعض اہم تاثراتی اور جذباتی رائیں اس بات کی مظہر کہی جا سکتی ہیں کہ وہ نظریہ سازی کے لیے کوشاں ضرور تھے۔ تنقید کا تفاعل جس طور پر تعقل اور ٹھہراؤ کا متقاضی ہے، آزاد کے عمل میں اس فقدان کی وجہ ان کی اسلوب کی پرستاری کے رویے میں مضمر ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ ہمیشہ بہ یک وقت کئی کشتیوں پر سوار رہے۔ اسی لیے کسی ایک کے ساتھ پوری یک سوئی سے وفا نبھانا ان کے لیے آسان نہ تھا۔ ان کے خطوط اور ان کے اعزا کی تحریروں سے ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ان کی ترجیح اپنے ہر منصوبے کو کئی بلند کوش مقاصد کے تابع رکھنے پر زیادہ تھی، ایک بڑا مقصد 'تکمیل کی جستجو' سے عبارت تھا کہ اپنی ایک ہی تحریر میں کس طرح زیادہ سے زیادہ علم اور معلومات کے اس ذخیرے کو سمویا جا سکتا ہے جس میں خود بڑا انتشار ہوا کرتا تھا۔ ایک چیز مکمل نہیں ہو پاتی تھی یا اس سے متعلق تحقیق و جستجو کا عمل ابھی جاری ہی تھا کہ وہ دوسرے منصوبے کی خاکہ آرائی کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ کلیات ذوق کی تدوین دربارِ اکبری، آبِ حیات وغیرہ کے ساتھ بھی یہی صورت قائم رہی۔

'آبِ حیات' پر کسی بھی گفتگو سے پہلے ہمیں اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا شمار ان اولین تذکروں میں ہوتا ہے جو فارسی کے بجائے اردو میں لکھے گئے تھے۔ تحقیق وتدوین کے ضابطوں کی بات تو بہت دور رہی تذکرہ نگاری کے اصولوں کی معیار بندی بھی تاہنوز نہیں ہو پائی تھی۔ زبان کی تاریخ یا دوسری زبانوں سے اس کے رشتے کی نوعیّتوں پر بھی انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے کسی ایسی کوشش کا پتہ نہیں چلتا جس سے ہم اپنی اگلی راہوں کا تعین کر سکتے۔ 'آبِ حیات' میں وہ تمام کمزوریاں ہیں جو ان سے پہلے کے تذکروں میں راہ پاتی رہی ہیں، بعض وہ خوبیاں بھی ہیں جو کسی دوسرے تذکرے میں دستیاب نہیں ہیں۔

☆

'آبِ حیات' کے مآخذ پر سب سے پہلے اور بڑی تفصیل کے ساتھ حافظ محمود شیرانی نے تحقیق کی تھی اور میر قدرت اللہ قاسم کے 'مجموعہ نغز' کے حوالوں کے روشنی میں یہ ثابت کیا تھا کہ آزاد کی غلط اور صحیح معلومات کا منبع بھی یہی تذکرہ ہے۔ 'مجموعۂ نغز' بھی ایک تذکرہ ہی ہے۔ جس کی معلومات کے سرچشمے وہ دوسرے تمام تذکرے تھے جو اس سے قبل شائع ہو چکے تھے یا جنہیں سنی سنائی باتوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں کے مقابلے میں آزاد نے مواد کو جمع کرنے میں سب سے زیادہ کاوش کی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے متعدد خطوط بھی لکھے اور آرا بھی جمع کیں اور دوسرے ایڈیشن میں ان کمیوں کو دور کرنے میں کشادہ نفسی کا ثبوت بھی دیا، جن کی طرف بعض احباب نے انہیں متوجہ کیا تھا۔ جہاں بانو بیگم نے 1940ء میں آبِ حیات کو بالکل انوکھا اور جدید طرز کا تذکرہ قرار دیتے ہوئے لکھا تھا:

> ''یہ جدید طرز کا سب سے پہلا تذکرہ اور اپنے وقت کے سارے تذکروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل شعرا کے کلام پر یا تقریظیں ہوتی تھیں یا اس کی تعریفیں۔ آزاد نے سب سے پہلے تنقید کا راستہ نکالا اور حتی الامکان تحقیق اور تدقیق سے کام لیا (جس پر خواجہ احمد

فاروقی نے یہ حاشیہ آرائی کی ہے کہ تحقیق کے میدان میں آزاد سے زیادہ پھسڈی اور تدقیق کے معاملے میں اُن سے زیادہ پھوہڑ کوئی شاید ہی ہوا ہو) بڑی محنت اور کاوش سے حالات جمع کیے۔ روایات اکٹھا کیں اور جزئیات کو محققانہ انداز سے جمع کر کے واقعاتِ زندگی ترتیب دیے۔ عادات، اطوار، خصائل، چال چلن، علمی تبحر، ماحول، خصوصیات، کلام، غرض ہر ایک ضروری بات کا پتہ چلایا اور آنے والوں کے لیے فن تنقید کا دیا روشن کر دیا۔ تنقید نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے اس پر بعض اعتراضات کیے ہیں لیکن ہر شخص اپنی رائے دینے اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آبِ حیات کی تنقیدیں اور آبِ حیات کا پیرایہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر اس کے تنقید کی پیرائے میں کوئی سقم ہے تو اس قدر کہ اس میں تنقیدی زبان کے بجائے افسانوی زبان استعمال کی گئی ہے۔''

میں نے اتنے طویل اقتباس کا حوالہ اس وجہ سے دنیا ضروری سمجھا کہ جہاں بانو بیگم کی اس تحریر کا شمار آزاد کے سوانح اور ان کی تصنیفات پر لکھے ہوئے اولین تحقیقی کاموں میں کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ایک دوسرے سے نہ صرف یہ کہ معلومات اخذ کی ہیں بلکہ کلام کے انتخاب میں بھی اکثر دوسروں کی بیاضوں ہی پر اکتفا کیا ہے۔ آزاد کا بنیادی مقصد تنقید نہ تھا بلکہ ماضی کے جن اکابرین نے ادب کا عظیم ورثہ یادگار چھوڑا ہے وہ بڑی تیزی کے ساتھ طاقِ نسیان کی زینت بنتا جا رہا تھا۔ اُسے فراموش گاری کی دھند سے نکالنا اور نئی نسلوں کو اس وراثت کی اہمیت، معنویت اور عظمت کا احساس دلانا ہی ان کا مقصود تھا۔ آبِ حیات کے دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے:

> ''سودا اور میر وغیرہ بزرگانِ سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے وہ آج کل لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ سبب پوچھیے تو جواب فقط یہی ہے کہ

جس طرح ان کے کلاموں کو ان کے حالات اور وقتوں کے واردات نے خلعت اور لباس بنا کر ہمارے سامنے جلوہ دیا ہوا ہے اس سے اربابِ زمانہ کے دیدہ و دل بے خبر ہیں اور حق پوچھو تو انہی اوصاف سے سودا۔ سودا اور میر تقی میر صاحب ہیں۔ ورنہ جس کا جی چاہے یہی تخلص رکھ کر دیکھے۔ خالی سودا ہے تو جنوں ہے اور نرا میر ہے تو گنجفہ کا ایک پتّا..... غرض خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو۔''[1]

اس اقتباس سے یہی مظہر ہے کہ آزاد کا خاص قصد اپنے ان بزرگ اکابرین کے سوانح، ان کے عادات واطوار، ان کے معمولات، ان کی رفاقتیں ان کی رقابتیں، ان کے کردار کی خامیاں ان کی خوبیاں، ان کی نفسیاتی کجی، ان کی کشادہ نفسی وغیرہ کو نمایاں کر کے دکھایا جائے۔ 1857ء کے ہولناک سانحے کے بعد جس تہذیبی انتشار اور نفسیاتی پسپائی سے پوری قوم دوچار تھی اس کی تازہ دمی کا احساس ابھی باقی تھا۔ حال کے مایوس کن گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ماضی کے جلال و جمال کی یاد آوری ہی روشنی کی ایک کرن کے طور پر فریبِ نظری کا سامنا مہیا کر سکتی تھی۔ پامالی اور ناکامی کے تجربے کے بعد انسان یا تو مذہب میں پناہ لیتا ہے یا اسلاف کی تاریخ کی ورق گردانی یا اس کے آموختے میں اسے بڑی طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے ہی ادوار میں ماضی کی بلند و بالا شخصیات کے ذکر و اذکار سے سنسان اور تیرہ و تار مجلسوں میں کچھ فریب آگیں ایقانات کی مشعلیں جگمگانے لگتی ہیں۔ احتساب میں جو اذیت ناکی ہے اس سے تھوڑی فرار کی صورت نکل آتی ہے۔ یہ اذیت سرسید اور ان کے رفقاء کی تقدیر کا اندوختہ تھا۔ جو اخلاقی اور سماجی مشن لے کر چلے تھے۔ حالی کی بازخوانی میں طعن و تعریض بھی تھی اور ایک بھولے ہوئے سبق کی یاد آوری بھی۔ ان کے مقصد کی سوئی

---

[1] 'آب حیات' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1981ء صفحہ 3-4

ادب کی اصلاح کی طرف تھی، جس کا خاکہ 'نیچر' کے نام سے سرسید پہلے ہی بنا چکے تھے اور محمد حسین آزاد اپنی کئی تحریروں میں اصلیت [1] اور صداقت آفرینی کی تلقین کر چکے تھے۔

☆

حالی نے اپنی مسدس اور سوانحات میں ماضی قریب [2] و بعید کی بازآفرینیوں میں

---

[1] یہ افسوس...... دل سے نہیں بھولتا کہ انہوں نے (بزرگوں نے) ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا۔ مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت۔ ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق وشوق میں خیال پیدا کرنے لگے اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پرواہ ہو گئے۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا اور نوبت یہ ہوئی کہ اگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح پنج رقعہ اور مینا بازار یا فسانۂ عجائب لکھ سکتے ہیں لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کر سکتے جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعۂ مذکور کیوں کر ہوا اور کیوں کر اختتام کو پہنچا۔ (آبِ حیات: اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو 1982ء صفحہ 57-58)

[2] اس سلسلے میں حسن عسکری نے شبلی اور حالی سے موازنے کرتے ہوئے آزاد کے اس تاریخی شعور پر بحث کی ہے جو اکثر ماضی کی بازخوانی پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔' وہ لکھتے ہیں تو اپنے سارے احترام کے باوجود انہیں یہ احساس رہتا ہے کہ ہم ماضی کے بارے میں لکھ رہے ہیں بلکہ حالی تو ماضی کا تذکرہ معذرت کے انداز میں کرتے ہیں......

آزاد کے لیے ماضی ایک زندہ حقیقت تھا۔ اس کی پرچھائیاں اور برائیاں دیکھنے کا انہیں خیال ہی نہ آتا تھا۔ اخلاقی الجھنوں میں پڑے بغیر اپنے موضوع کو قبول کرنے کی صلاحیت ایسی چیز ہے جو اس دور میں آزاد کے سوا اردو کے کسی اور نثر نگار میں نظر نہیں آتی۔

شبلی اور حالی کسی شخص کے حالات لکھتے ہوئے اس کی وہ باتیں یا کام نقل کرتے ہیں جن سے چند خیالات اخذ کیے جا سکیں...... اور یہ خیالات عموماً وہ ہوتے ہیں جن سے مصنف کے نزدیک قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں ان دونوں کو براہِ راست انسانی افعال اور انسانی جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برخلاف آزاد اگر کوئی بات دیکھتے ہیں تو انسانی زندگی کے مظاہر۔ پھر انہیں یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ ان مظاہر سے اخلاقی سبق کیا نکلتا ہے۔ ان کے لیے تو ان کی زندگی بذات خود اور برائے خود دلچسپی کی مستحق ہے۔ ادبی تخلیق کی بنیاد یہی احساس ہے۔ آزاد کا تخیل اصل میں مورخ یا نقاد کا تخیل نہیں بلکہ افسانہ نگار کا تخیل تھا۔

...... وہ ایک پورے معاشرے کی اندرونی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کی دربار اکبری یا قصص ہند یا آبِ حیات پڑھ کر ممکن ہے ہم اصل تاریخی واقعات بھول جاتے ہوں یا تاریخ سے ہماری واقفیت ناقص رہ جاتی ہو لیکن جس معاشرے نے یہ تاریخ پیدا کی ہے، وہ ہمارے دل و دماغ میں بس جاتا ہے۔ وہ واقعات کی فہرست نہیں بتاتے بلکہ ان واقعات کے پیچھے جو اجتماعی روح کام کر رہی تھی اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔ وہ ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ ہمیں ایک نیا تجربہ دیتے ہیں۔'

(بحوالہ شمیم حنفی، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ، دہلی 2003ء صفحہ 278-79)

سنبھالا لیا۔ آزاد، شبلی اور شرر نے تاریخ میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ دربارِ اکبری، سخن دانِ فارس، نگارستانِ پارس یا تذکرۂ سنین اسلام ہی نہیں آبِ حیات کو بھی اس زمرے میں شامل کرنا چاہیے۔ جس میں انہوں نے بڑی جگر کاوی اور فن کاری کے ساتھ ان شعرا کی مجلس آرائی کی ہے۔ جنہوں نے کسی نہ کسی سطح پر عہد سازی کا کام کیا تھا یا کم ازکم قابلِ ذکر ضرور تھے۔ 'آبِ حیات' اردو شاعری کی تاریخ سے زیادہ اردو شاعری کی روایات کی سلسلہ وار تاریخ ہے۔ جس میں کئی قسم کی کوتاہیاں بھی در آئی ہیں۔ ان کوتاہیوں کے باوجود وہ ایک مستقل کتاب حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق (پاکستان) نے ان کوتاہیوں کا تفصیل کے ساتھ محاسبہ کیا ہے۔ تاہم وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

> ''یہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے اردو ادب کی ایک بہت کمی پوری ہوئی۔ اب تک اردو میں شعرا کا کوئی باقاعدہ تاریخ وار تذکرہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ پرانے انداز کے تذکرے تو بہت تھے، لیکن اکثر ناتمام اور ناقص۔ کوئی کسی عہد سے متعلق تو کوئی کسی عہد سے۔ اکثر ایسے تھے کہ ان میں تنقید یا ادب کا شائبہ تھا نہ کوئی انسانی دلچسپی۔ جس قسم کی کتاب درکار تھی وہ ایک ایسا تذکرہ تھا جس میں شعرا کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہوں، جدید انداز میں تنقید بھی ہو اور تحقیق پر مبنی سیر حاصل اور مستند حالات بھی ہوں۔ یہ کمی 'آب حیات' نے پوری کردی۔ 'آب حیات' محض اردو شاعری کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک توانا، متحرک اور زندگی سے لبریز دستاویز ہے جو عہد ماضی کو از سرِ نو زندہ کر کے ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ بلا مبالغہ ہمارے ادب میں ایسی اور کوئی کتاب نہیں۔''[1]

☆

ہمیں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ آزاد کے عہد تک ادب اور تاریخ کے رشتے

---

[1] (محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور 1976ء صفحہ 85-86)

کونظریاتی اساس نہیں ملی تھی اور نہ ہی ادیب وشاعر کی شخصیت کے ان عوامل کو کوئی نام دیا گیا تھا جن کا تجزیہ نفسیاتی نقطہ نظر سے کیا جاتا ۔ آزاد نے ہمارے اسلاف کی جو تصویریں خلق کی ہیں اور جن تناظرات میں ان کے کردار کی نشو ونما ہوئی ہے۔ وہ خود ایک ایسا مواد ہے جونفسیاتی تجزیہ کاری [1] کے لیے موزوں تر ہے۔ ہمارے اکثر سوانحی نقادوں نے یاان نقادوں نے جو شاعر کی شخصیت کوبھی تفہیم شعر کے ضمن میں ایک اہم موضوع قرار دیتے ہیں، آزاد سے کم یا زیادہ اخذ ضرور کیا ہے۔ اب ذرا آزاد کی ان عبارتوں پر غور کریں جوزندگی کی فہم اور کردار کی فہم کے بلیغ تاثر سے مملو ہیں۔

1- شعرا میں اپنے لیے خود پسندی اور دوسروں کے لیے ناتواں بینی۔ ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔

2- باوجود یکہ عزتِ خاندان اور نفس کمالات کی حیثیت سے خانِ موصوف (خان آرزو) کو امراء وغربا سب معزز ومحترم سمجھتے تھے اور علم وفضل کے اعتبار سے قاضی القضات کا عہدہ دربارِ شاہی سے حاصل کیا مگر مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کی ظرافت نے دماغ میں خود پسندی اور تمکنت کی بو نہیں آنے دی۔

3- سودا کے بارے میں لکھتے ہیں: طبیعت کی شوخی اور زندہ دلی کسی طرح کے فکر وتردد کو پاس نہ آنے دیتی تھی۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی اور اس شدت کے ساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا نہ کوئی خطرا سے دبا سکتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے کچھ اور بس نہ چلتا تھا۔ جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار

---

[1] ''...... آزاد نہ تو خود نفسیاتی نقاد تھے، نہ وہ نفسیات سے آگاہ تھے (بلکہ اس وقت ابھی جدید نفسیات معرض وجود میں نہ آئی تھی) اور نہ ہی وہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے لکھ رہے تھے۔ بالفاظ دیگر 'آب حیات' کی شخصیت نگاری کے مطالعے میں یہ حقیقت ملحوظ رکھنی چاہیے کہ آزاد قدیم تذکرہ نگاروں کے میکانکی انداز سے ہٹ کر ایک تذکرہ لکھ رہے تھے۔ ایسا تذکرہ جس میں وہ شعرا کو زندہ تو دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن تحلیل نفسی کے معالج کے کوچ پر لٹانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے 'آب حیات' کا مطالعہ کرنے سے آزاد کے قلم کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے میر، سودا اور انشاء وغیرہ کی شخصیت نگاری میں ان کی نفسیات کے بعض گوشے بھی منور کر دیے۔ میر کی بد دماغی، سودا کی ہجو گوئی اور انشا کی چلبلاہٹ اور پھر آخر عمر میں مجذوب بن جانا ان سب میں نفسیاتی اشارات نہاں ہیں''۔ (ڈاکٹر سلیم اختر۔ نفسیاتی تنقید مجلس ترقی ادب، لاہور 1986ء صفحہ 12-13)

کر دیتے تھے۔

4۔ شاہ صاحب (شاہ نصیر) نہایت نفیس طبع اور لطیف مزاج تھے۔ خوش پوشاک خوش لباس رہتے تھے اور اس میں ہمیشہ ایک وضع کے پابند تھے جو کہ دہلی کے قدیم خاندانیوں کا قانون ہے۔ ان کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت اور ادب پیدا کرتی تھی۔ وہ اگر چہ رنگت کے گورے نہ تھے، مگر نورِ معنی سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ بدن چھریرا اور کشیدہ قامت تھے۔ جس قدر ریش مبارک مختصر اور وجاہت ظاہری کم تھی اس سے ہزار درجہ زیادہ خلعتِ کمال نے شان وشوکت بڑھائی تھی۔

5۔ شیخ ابراہیم ذوق جس مکان میں بیٹھتے تھے، تنگ وتاریک تھا۔ گرمی میں دل دق ہو جاتا تھا۔ بعض قدیمی احباب کبھی جاتے تو گھبرا جاتے اور کہتے کہ یہ مکان بدلو۔ گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں تم کیوں کر دن رات یہیں کاٹتے ہو؟ وہ ہوں ہاں کرتے اور چپکے رہتے۔ کبھی مسکراتے۔ کبھی جو غزل کہتے ہوتے اسے دیکھنے لگتے۔ کبھی ان کا منہ دیکھتے۔ خدا نے مکانات، باغ، آرام وآسائش کے سامان سب دیے تھے۔ مگر وہ وہیں بیٹھے رہے اور ایسے بیٹھے کے مر کر اٹھے۔

یہ چند مثالیں تفہیم وتنقید شعر کے لیے شاید ہمارے کسی کام نہ آسکیں۔ لیکن شاعر کی شخصیت اور اس کے مختلف تناظرات کبھی کبھی شاعر کی ذہنی گرہوں اور گتھیوں کو سمجھنے میں ضرور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کہیں شعر وشخصیت میں تطابق کے آثار بے حد نمایاں دکھائی دیتے ہیں کہیں تطابق زیریں اور زیریں سطحوں میں واقع ہوتا ہے۔ کہیں تضاد کی وہ صورت نظر آتی ہے جسے لخت لخت شخصیت کے حاوی کردار کا نام دیا جاسکتا ہے۔ آزاد باہر کی دنیا ہی کی سیاحی نہیں کرتے اندر اور اندر ذہن کے بطون اور ذہن کی کارکردگی اور کسی حد تک ان محرکات تک بھی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی بہت خاموشی اور کبھی بہت شور کے ساتھ انسانی مقدرات کی کایا ہی پلٹ دیتے ہیں۔ وہ پوری آواز کی بلندی کے ساتھ تاریخ کے کردار کو کوئی نام نہیں دیتے لیکن ہر دور کے ساتھ جو تہذیبی تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں، مجلسیں بنتی ہیں مجلسیں بگڑتی ہیں۔ انسانی معاملات ومعلومات میں جو فرق واقع ہوتا رہتا

ہے۔ اس کی پشت پر تاریخ کے عمل سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آزاد کے نزدیک تاریخ کے بیرونی کردار سے زیادہ تاریخ کی باطنی کردار کی خاص اہمیت تھی۔ زندگی فہمی اور کردار فہمی میں بھی ان کا یہی طریقِ عمل ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے باطن میں نقب لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ انسان ایک مستقل صیغہ اسرار ہے۔ دوسروں ہی کے لیے نہیں خود کے لیے بھی وہ ایک نا قابل حل معمے سے کم نہیں ہے۔ میر، ذوق اور انشا کی شخصیات کی گتھیاں اسی نوع کی ہیں۔

☆

'آبِ حیات' کی تلفیظ (ڈکشن) کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا فعلیہ کردار ہے۔ اکثر ان کی ایک ہی عبارت اور ایک ہی جملے میں افعال کی متواتر تکرار سے ایک حرکت آفریں فضا سی قائم ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس فضا کو وہ ماضی سے اخذ کرنے کے درپے ہیں یا گزشتگان میں سے جس کردار کو انہوں نے موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ صیغۂ حال میں ان کے سامنے حاضر ہے۔ پھر اس کی مرقع کشی اس طور پر کرتے ہیں کہ وہ اپنے سارے محاسن اور سارے عیوب، سارے غیاب اور ساری برہنگی کے ساتھ قاری کے حضور آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ساری چیزیں صیغہ حال میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے بیانیہ اور ڈرامہ، دونوں تکنیکیں 'آب حیات' میں ساتھ ساتھ عمل آور ہوتی ہیں۔ اور اس خوبی اور فن کاری سے عمل آور ہوتی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

> ''قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ لوگ ہیں ان کا آنا غضب کا آنا ہے۔ ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طرارئ طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں گے اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے۔ مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انہیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان

سے سجائیں گے ۔ اور ہر شئے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرے سجائیں گے کبھی انہیں کو پھولوں کی گیندیں بنالائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا لے گا۔ ایسے قدر دان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول بکے گا۔''

یہاں آزاد نے مستقبل کو حال میں ضم کر دیا ہے۔ یہ تکنیک افسانوی فن سے تعلق رکھتی ہے فکشن نگار ایک ہمہ دان شخصیت کا کردار ادا کرتا ہے، جس کا رخ کبھی ماضی کی طرف ہو جاتا ہے اور کبھی مستقبل کی طرف اور کبھی سارے زمانوں کے تانے بانے اس کمالِ ہوشیاری سے حال موجود سے جوڑ دیتا ہے کہ کوئی مہلتِ زماں بے جوڑ یا زائد نہیں معلوم ہوتی۔ یہ جلسہ جو چوتھے دور سے تعلق رکھتا ہے جب اپنے اختتام کو پہنچتا ہے تو آزادی کی جذِ باتی کیفیت کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ وہ عالم بھی اپنا ایک مقام رکھتا ہے:

''اے فلک نہ یہ جلسہ برہم ہونے کے قابل تھا۔ نہ آج رات کا سماں صبح ہونے کے قابل تھا۔ پھر ایسے لوگ کہاں! اور ایسے زمانے کہاں! سید انشا اور جرأت جیسے زندہ دل شوخ طبع، باکمال کہاں سے آئیں گے۔ شیخ مصحفی جیسے مشاق کیوں کر زندہ ہو جائیں گے۔ اور آئیں تو ایسے قدر دان کہاں! اچھے لوگ تھے کہ اچھا زمانہ پایا اور اچھی گزار گئے وہ جوش وخروش وہ چہلیں اب کہاں!

گیا حسنِ خوبانِ دلخواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میرا دل جانے کس مٹی کا بنا ہے۔ کسی کی جدائی کا نام لیا یہ پگل گیا۔ کسی عزیز کا ذکر کیا اس سے خون ٹپک پڑا اور سخت جانی دیکھو کہ نہ پانی ہو کہ بہہ جاتا ہے نہ خاک ہو کر رہ جاتا ہے تماشہ یہ ہے کہ کتنے صدمے اٹھا چکا ہے پھر بھی ہر داغ نیا ہی صدمہ دیتا ہے مگر انصاف کرو وہ عزیز بھی تو

دیکھو کیسے تھے! اور کون تھے! عالم کے عزیز تھے اور ہر دل کے عزیز تھے اپنی
باتوں سے عزیز تھے۔ آزاد بس۔ رونا دھونا موقوف۔ اب آنسو پونچھ
ڈالو۔ ادب کی آنکھیں کھولو۔ اور سامنے نگاہ کرو"۔

اس طرح کی داخلی کلامی کی صورتوں سے ہم اکثر دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے دورانیے میں آزاد کے جذبوں میں کچھ زیادہ ہی شدت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں اپنے غم کبھی نہیں بھولتے۔ ان کے یہ الفاظ کہ میرا دل جانے کس مٹی کا بنا ہے کسی کی جدائی کا نام لیا یہ پگل گیا۔ کسی عزیز کا ذکر کیا اس سے خون ٹپک پڑا اور سخت جانی دیکھو کہ نہ پانی ہو کر بہہ جاتا ہے نہ خاک ہو کر رہ جاتا ہے تماشہ یہ ہے کہ کتنے صدمے اٹھا چکا ہے پھر بھی ہر داغ نیا ہی صدمہ دیتا ہے۔ اس عبارت کے تحت المتن میں آزاد نے اپنی داستانِ دلخراش ہی بہ اندازِ دگر سنانے کی کوشش کی ہے۔

☆

آزاد کو زبان کی تاریخ اور مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے سے خاص دلچسپی تھی۔ آب حیات کا پہلا حصہ اردو زبان کی تاریخ اس کے دوسری زبانوں اور بولیوں (پراکرت) سے رشتے، بھاشا اور فارسی زبان کے فرق، سنسکرت زبان کی قدامت اور اس کی اہمیت، سنسکرت اور فارسی قدیم سے اس کے رشتے، برج بھاشا پر عربی و فارسی زبانوں کے اثرات وغیرہ جیسے موضوعات و مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ اگرچہ بعد کی لسانیاتی تحقیقات نے آزاد کے بہت سے فیصلے رد کر دیے ہیں لیکن آزاد نے محدود تر وسائل کے باوجود جو تصورات قائم کیے ان کی آج بھی کم اہمیت نہیں ہے کہ اتنی تفصیل و استدلال کے ساتھ نہ تو ان کے عہد میں اور نہ ان سے پہلے کسی نے تحقیق و کاوش کی تھی۔ خان آرزو نے فارسی اور سنسکرت کی جڑیں ایک ہی ضرور بتائی تھیں لیکن دیگر ایسے بہت سے متعلقات تھے جن کی تفصیل وہ مہیا نہ کر سکے۔ یہ کام آزاد نے کیا اور زیادہ ایقان و اعتماد کے ساتھ کیا۔ آزاد کے دلائل اپنا وزن رکھتے ہیں۔ تحقیق کا کام ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے اور نئی دریافتوں کے بموجب پرانی دریافتوں کو رد کرنا بھی ہوتا ہے۔ مسترد ہونے سے پرانی

دریافتوں کی اہمیت اور معنویت ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تحقیق کی تاریخ میں اس کا بھی ایک اہم درجہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وزیر آغا نے لکھا ہے:

''آب حیات میں آزاد کے افکار جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض نکات تو اس قدر زرخیز ہیں کہ ان کے باعث تحقیق کے نئے باب کھلتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً آزاد نے اردو کی ابتداء کے سلسلے میں جب برج بھاشا کا نام لیا یا پراکرتوں کو قدیم سنسکرت کے بجائے یہاں کی دیسی بولیوں سے منسلک کیا تو لسانی تحقیق کی ایک پوری راہ منور ہوگئی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو میں لسانیات کے سلسلے میں آزاد ہی نے ابتداء کی اور نہ صرف ایک باقاعدہ نظریہ پیش کیا بلکہ ایسے ایسے نئے نکات بھی سامنے لائے کہ جن پر آج مختلف نظریات کے رنگ محل تعمیر کیے جا رہے ہیں''۔ [1]

جہاں تک آزاد کے تصور نقد کا سوال ہے۔ 'آب حیات' کوئی واضح نقطہ نظر نہیں فراہم کرتی۔ آزاد کی بیش تر رایوں اور فیصلوں میں عجلت کا پہلو حاوی ہے۔ کہیں انہوں نے اپنے بزرگوں کی رایوں ہی کو دہرانے میں اکتفا کیا ہے کہیں بہت سرسری گزر گئے ہیں اور کہیں کسی کی تعریف و تحسین میں اسمائے صفات کی بھرمار لگا دی ہے۔ جس طرح تخیل کی آزادہ روی تحقیق کی راہ میں مانع تھی تنقید کے تفاعل پر بھی قدغن لگا دیتی ہے۔ انجمن پنجاب کے خطبات والے آزاد اور آب حیات والے آزاد میں بڑا فرق ہے۔ ان خطبات میں مغربیت کی پرزور وکالت ہے لیکن آب حیات کے تبصروں میں صرف اور صرف مشرقی پیمانوں ہی کو آزمایا گیا ہے۔ آزاد کے قلم میں وہاں ضرورت سے زیادہ چمک آ جاتی ہے، جہاں شخصیت اور شاعری میں انہیں کوئی تال میل دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ شخصیت کے کسی پہلو کی توثیق کے لیے شعر اور شعر کے کسی پہلو کی توثیق کے لیے شخصیت ان کی رائے کے حق میں ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔

---

[1] (نئے مقالات: سرگودھا 1972ء صفحہ 331)

☆

آزاد کی مغرب کی وکالت محض ایک بھرم تھا۔ 'آب حیات' کے مطالعے کے دوران ان کے 'انگریزی لالٹینوں' والے دعووں سے صرف نظر کرتے ہوئے اسے ایک ایسے ادیب کی تصنیف کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے جو سہ تاسر مشرقی ذہن رکھتا ہے اور جس کی ذہنی اور شعری تربیت مشرقی معیاروں کے تحت ہوئی تھی۔ مشرق و مغرب کی کشاکش اور کشمکش نے جہاں بہت سے امکانات پر جلا کا کام کیا تھا وہیں بہت سے امکانات پر قدغن بھی لگادی تھی۔ 'آب حیات' کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مشرق و مغرب کی کشمکش سے عاری ہے۔

دربارِ اکبری

مغل بادشاہوں میں جلال الدین محمد اکبر کا ایک اہم مقام ہے۔ مغلیہ دور میں بھی اکبر کے نظام سلطنت اور اس کی سیاسی بصیرت کو مثالی قرار دیا جاتا تھا۔ آزاد کی تصنیف دربارِ اکبری سے قبل بھی اکبر کی زندگی اور اس کے کارناموں پر کافی لکھا جا چکا تھا۔ یہ سارا سرمایہ بہ زبانِ فارسی ہے۔ جب کہ دربارِ اکبری، اردو میں ہے۔ آزاد کو اکبر اور اس کی وسیع المشربی اور اس کے عہد سے خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اکبر کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ جس میں جہاں گیر اور نور جہاں کے عشق کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ خانوادہ اکبر سے تعلق رکھنے کے باعث اس کی خاص اہمیت ہے۔ یہ ڈرامہ 1922ء میں شائع ہوا۔

دُبارِ اکبری، پہلی بار میر ممتاز علی کے دیباچے کے ساتھ 1898ء میں شائع ہوئی۔[1] آزاد کی یہ سب سے ضخیم تصنیف ہے، جس پر انہوں نے برسوں کام کیا۔ درمیان میں کئی دوسرے کام آتے رہے، انہیں بھی بخیر وخوبی انجام دیتے رہے۔ آخری بار جس توجہ اور ذمہ داری اور باریک بینی کے ساتھ نظر ثانی کرنی تھی اور اسے ایک خاص نظم وترتیب دینی تھی۔ وہ نہیں کر پائے۔ بلکہ دربار اکبری کے مسودے مختلف مسودات کے ڈھیر میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عالم دیوانگی میں آزاد کو یہ شبہ تھا کہ کوئی اس مسودے کو چرا کر شائع نہ کر دے۔ اس لئے وہ اسے مختلف مسودات کے درمیان چھپا کر رکھتے تھے۔ میر ممتاز علی کے لفظوں میں آزاد نے اصل مسودے کو مقرر کرتے ہوئے لکھا

---

[1] طالب الہ آبادی کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب 1898ء میں مطبع رفاہِ عام کے مالک وناظم منشی سید ممتاز علی نے چھپوائی ہے۔ اُس وقت اس کی ضخامت صرف 128 صفحات کی تھی۔ دوسری مرتبہ محمد ابراہیم صاحب (فرزندِ آزاد مرحوم) نے 1910 میں اصل مسودے کی مدد سے شائع کی۔ جس کا حجم یک بارگی 128 سے 840 صفحات کا ہو گیا۔

ہے کہ میر ممتاز علی کو انہوں نے ہی اصل مسودہ دیا تھا، جو ان کے پاس موجود ہے۔ اس لئے دریائے راوی میں پھینکنے یا اس کے تلف ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ ہی بقول ڈاکٹر محمد صادق یہ دعویٰ کوئی معنی رکھتا ہے کہ میر ممتاز علی نے اس کا ضمیمہ تیار کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد صادق نے ضمیمے کی تحریر کا اسلوبی سطح پر تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ''داخلی شہادت کی بنا پر یہ باور کرنے کی معقول وجوہ ہیں کہ تقریباً سارے کا سارا ضمیمہ یا کم سے کم اس کا بیش تر حصہ آزاد کے سوا اور کسی کی تحریر نہیں ہوسکتا۔''

اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ دربار اکبری کے اس اولین ایڈیشن کے دیباچے یا ضمیمے کو پڑھ کر ہمارے ریسرچ اسکالرز کہیں گم راہ نہ ہو جائیں۔

☆

'دربار اکبری' محض دربار کے امراء کے سوانح پر مبنی نہیں ہے بلکہ اکبر کے روز وشب ان کی معاملہ فہمی اور انسان فہمی، ان کی سیاسی حکمت عملی، جنگی مہمات، مختلف فنون کے ماہرین اور امراء سے ان کے تعلق کی نوعیت، ان کی وسیع المشربی اور مذہبی تصورات، ان کے عہد کی تصانیف اور عمارات، ان کے عادات وخصائل، ان کے بچپن اور لڑکپن سے لے کر بڑھاپے تک کے اہم سوانحی مراحل گویا اکبر کی زندگی کے مختلف ادوار کو بڑے موثر اور دلپذیر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہیں ایک ایک جز کی تفصیل میں طوالت کی کوئی حد قائم نہیں کی اور کہیں ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھا تو کم سے کم میں زیادہ سے زیادہ کو اس طور پر سمویا کہ کسی کوتاہی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھئے بچپن سے لے کر بلوغت تک کے مراحل کو کس کفایت لفظی نیز بے تکلفی کے ساتھ پیش کر دیا ہے:

> ''اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کے پڑھنے کا وقت تھا۔ کبوتروں میں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانہ لے کر آئی۔ بسرم خاں، وزیر صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر وشکار اور شراب کباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں

مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوعِ جوانی میں آ کر کچھ عرصے تک ایسے پرہیز گار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالبِ علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکاری بھی برابر جاری تھی مگر وہ علم کا عاشق، علم وحکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ 20 برس تک دیوانی، فوج داری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرنا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا، ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے، صلاح واصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا۔''

دربار اکبری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزاد کے حسنِ اسلوب کے پیش نظر یہ تاریخ کم افسانہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ آزاد میں تحقیق وجستجو کا ایک خاص مادہ تھا۔ جامع اللغات فارسی کے لئے انہوں نے محض موجود فارسی لغات ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سیاحتِ ایران کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے لئے مفید مطلب مواد اکٹھا کیا جاسکے، دربار اکبری کے تعلق سے بھی مدتوں وہ غور وفکر میں مشغول رہے۔ کوئی تزک یا تاریخ ایسی نہیں

تھی جسے انہوں نے تحقیق کی نظر سے نہ دیکھا ہو۔ تاریخ کو دیکھنے کے کئی زاویے ہیں۔ اور تاریخ کو ترتیب دینے کے اپنے اپنے طریق ہوتے ہیں۔ جو تاریخ کے متن پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی باعث تاریخ اور تاریخ میں بھی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ دربار اکبری اساساً ایک تحقیقی کام ہے، لیکن مختلف کڑیوں کو ایک ربط دینے کے لئے تاریخ نگار کو اکثر قیاس سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ کیوں کہ تاریخ نگار کا مقصد تاریخ کو ایک منظم پیرائے میں متنی شکل فراہم کرنا ہوتی ہے۔ آزاد کے مطمح نظر بھی تاریخ کو ضبطِ تحریر میں لانا تھا اور تحریر کے اپنے اجبار اور تقاضے ہوتے ہیں۔ اس معنی میں 'دربار اکبری' ایک خاص عہد کی تاریخ کے وسیع تر تناظر کو سمجھنے میں نہ صرف مددگار ثابت ہوسکتی ہے بلکہ کئی اعتبار سے تاریخ پر کام کرنے والوں کے لئے ایک مناسب دستاویز بھی ہے۔

آزاد لفظوں کے طوطا مینا بنانے میں بڑے مشاق واقع ہوئے ہیں۔ ان کی کوئی گفتار تشبیہہ اور استعارے سے نہ تو خالی ہوتی ہے اور نہ ہی سیدھی سادی، سپاٹ اور بے مزہ نثر لکھنے میں انہیں کوئی لطف آتا ہے۔ مجردات کو مشخص بنا کر پیش کرنے کی پشت پر ان کا مقصد بصری حاسے کو برانگیخت کرنا ہوتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے ان کی تحریر افسانہ ہی نہیں ڈرامے کی سی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں بانو بیگم نقوی نے آزاد کے طرز نگارش کے اسی پہلو پر بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''واقعہ یہ ہے کہ دربار اکبری کی مجلس آرائیاں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آزاد میں یہ عجیب وغریب کمال ہے۔ جب کہیں بزم کا نقشہ دکھاتے ہیں تو راحتِ حیات اور سکونِ زندگی کو مجسم کر کے سامنے لاتے ہیں۔ وزم کی تصویر اتارتے ہیں تو تلواروں کی چمک دمک الفاظ میں پرتو فگن ہو کر اپنا روپ دکھاتی ہے۔[1] اس کو پڑھنے سے

---

[1] یہ خصوصیت فردوسی کی ہے۔ فردوسی نے شاہ نامے میں رزم و بزم کی تصویر کشی اسی طور پر کی ہے۔ غالباً آزاد کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اسی لئے دربار اکبری کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جس سے شہنشاہ موصوف کے مذہب، اخلاق، عادات، سلطنت کے دستور و آداب اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات ان کے الفاظ و خیالات کے غلام ہیں۔

قلم چاہتا ہے دوست بستہ یا بجولاں قصوں اور کہانیوں کو سمیٹے ہوئے کھینچ کر لے جاتا ہے۔ کاغذی پیرہن پر گل بوٹے بناتا ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والے ساکت ہو جاتے ہیں۔ ان پر ایک کیفیت سی طاری رہتی ہے۔ کبھی طوفان کی آندھیاں چلاتے ہیں تو اوسان خطا ہو جاتے ہیں، میدانِ جنگ کا ہولناک نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ کبھی نسیم سحر کی ہلکی ہلکی لہروں کو فضائے قرطاس پر رقصاں ہونے کے لئے بلا لیتے ہیں۔ واقعات اصلیت کا بھیس بدل کر دل و دماغ کی کائنات میں نیا جنم لیتے ہیں۔''[1]

---

[1] جہاں بانو بیگم نقوی ''محمد حسین آزاد'' ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد 1940 صفحہ 107

دیوانِ ذوق

آزاد کا ذوق سے محض استادی شاگردی ہی کا رشتہ نہ تھا بلکہ مولوی باقر کے ساتھ جوان کی رفاقت تھی، اسی نے اس تعلق کو ایک جذباتی رشتے میں بدل دیا تھا۔ ذوق اب شاہ نصیر کے شاگرد ضرور تھے۔ لیکن ذوق میں خلاقی اور طباعی کا جوہر استاد سے زیادہ تھا۔ جس کی نظیر ان کے قصائد سے پوری طرح عیاں ہے۔ ذوق، بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی تھے اور دہلی اور بیرون دہلی بھی ان کا سکّہ رائج الوقت سمجھا جاتا تھا۔ ذوق کے آدابِ زندگی میں بے نیازی کا عنصر اس قدر حاوی تھا کہ کبھی اپنے کلام کو جمع کرنے کی طرف توجہ نہ دی۔ ان کا بیشتر کلام شاگردوں کو ذہن نشین تھا، یا اِدھر اُدھر پرزوں کی شکل میں بکھرا پڑا تھا۔ ذوق کی زندگی ہی میں آزاد اور ان کے والد نے کچھ کلام اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا، جو نا کافی تھا۔ وہ مسلسل تلاش وجستجو میں لگے رہے جہاں اور جس سے ملا اور جو کچھ کہ ان کی یادداشت میں محفوظ تھا اسے یک جا کرتے رہے؛ 'دہلی اردو اخبار' نے ذوق کی اس پریشاں خاطری کے بارے میں لکھا ہے:

> ''غزلہائے متفرقہ سالہا سال سے..... تھیلوں، مٹکوں میں ہزارہا پڑی ہیں۔ ان کے ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کی کہاں فرصت اور کہاں دماغ۔ بسا اوقات جو خواہش کسی غزل کہنہ کی کسی نے کی تو پایا تلاش وتجسس کا غذات سے، غزلِ جدید کہہ دینا آسان سمجھتے تھے۔ بہت جاں کا ہی اور تکلیف دہی سے ان کے کسی قلبی دوست کی اکثر اشعار غزل وقصائد جمع بھی ہوئے تو نوبت طبع دیوان کی نہ ہوئی اس امید پر کہ اور زیادہ مجتمع ہو جائیں''۔

☆

ذوق کی زندگی ہی میں ان کے کئی شاگردوں کے دیوان منظر عام پر آ چکے تھے۔ اس ن میں 'دہلی اردو اخبار' نے لکھا ہے:

''ان کی توجہات سے شاگردوں کے دیوان کئی کئی جلدوں میں مرتب ہو گئے لیکن طرفہ یہ کہ اپنا دیوان اب تک نہیں مرتب کیا۔ اگر کسی نے احباب تلامذہ میں سے تکلیف جمعیت دیوان دی بھی تو ہنس کر ٹال دیا اور کہا تو یہ کہا حضور والا کا دیوان مقدم ہے اور یہ بھی کہ اور لوگوں کی کارروائی اور دل داری رہ جائے گی''۔

آزاد نے 'آب حیات' میں ذوق کی اس تکلیف دہ فیاضانہ طبیعت کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں، ان سے یہی باور کرنا پڑتا ہے کہ ذوق نے اوروں کے گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے۔ آزاد لکھتے ہیں:

''اس میں کسی کو کلام نہیں کہ انہوں (ذوق) نے فکر سخن اور کثرتِ مشق میں فنافی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا اور انشا پردازیِ ہند کی روح کو شگفتہ کیا۔ مگر فصاحت کا دل کمھلا جاتا ہوگا جب ان کے دیوانِ مختصر پر نگاہ کرتی ہوگی۔ اس کی سبب کا بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا فسانہ ہے اور اس کی مرثیہ خوانی کرنی میرا فرض ہے۔ ان کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے۔ چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے ان میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی۔ کیوں کہ بچپن سے لے کر دم واپسیں تک کا کام انہی میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی۔ بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

چنانچہ اول ان کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے۔ یہ کام

مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا۔ مگر بہ اطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا..... دفعتاً 1857ء کا غدر ہوگیا۔ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے۔ جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے''۔

(آب حیات صفحہ 450-51)

☆

کلام ذوق کی پہلی اشاعت کا سہرا حافظ غلام رسول ویران کے سر ہے جو ذوق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، پانی پت سے تعلق تھا۔ بقول ان کے اس مجموعے موسوم بہ 'نسخہ ویراں' کا بیشتر حصہ بغیر کسی تحریف کے ان کی یادداشت کا مرہون ہے۔ اکثر غزلیں اور قصائد نامکمل ہیں، ردیف وار ترتیب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

☆

نسخۂ ویراں کے بعد 'نگارستانِ سخن' کے نام سے ظہیر دہلوی نے ذوق، غالب اور مومن کے کلام کا انتخاب ترتیب دیا تھا جس میں ذوق کی کچھ ایسی غزلیں بھی تھیں جو 'نسخۂ ویراں' میں شامل نہ تھیں۔ انہیں مجموعوں کی بنیاد پر دیوانِ ذوق کے اور بھی ایڈیشن منظر عام پر آئے لیکن فرد گزاشتوں سے کوئی خالی نہیں تھا۔ خود آزاد نے ان نسخوں کو دیکھ کر خون کے آنسو روئے (آبِ حیات میں یہ ذکر ہے) 'آبِ حیات' ابھی تکمیل کے مرحلے میں تھی، اس کے بعد ہی آزاد دیوان ذوق کی تدوین کا کام از سرِ نو شروع کرنے والے تھے کہ مختلف منصوبوں کے دباؤ نے انہیں یک سو ہونے کی اجازت ہی نہ دی۔ کافی وقت گزرنے کے بعد وہ پھر اس طرف متوجہ ہوئے۔ اس ضمن میں انہوں نے میجر سید حسن بلگرامی کو ایک مکتوب بھی لکھا تھا کہ:

''سخن دانِ فارس' کونظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہا کہ اب دربار اکبری کو سنبھالوں مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیوں کہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں اور قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں اگر میں ان کے ساتھ بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے بے موت مرجائے گا اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہوگا۔ ان کے حال پر افسوس نہیں یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے۔

چنانچہ اب اسے سنبھالا ہے اور اس میں یہ ارادہ ہے کہ جس قصیدے غزل یا شعر کے موقعہ پر کوئی تقریب کوئی معاملہ یا کوئی معرکہ پیش آیا وہ بھی نقل کر دیا جائے، کیوں کہ ہر وقت کا حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے۔ آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیں آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا۔ خدا انجام کو پہنچائے''۔

(بحوالہ کلیات ذوق (اردو) مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی،
دہلی تیسرا ایڈیشن 2002ء صفحہ 45)

☆

'دیوان ذوق' کی تدوین کے سلسلے میں آزاد کس قدر سنجیدہ اور فکر مند[1] تھے، ان کی اس تحریر سے پوری طرح ظاہر ہے۔ تدوین میں جو تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ یک وقت انہوں نے کئی منصوبوں کے خاکے بنا لیے تھے، ان کی تحقیق اور مواد کی تلاش و جستجو میں ان کی جفاکشی اور ان کے انہماک کا ان کے خطوط اور دوسری تحریروں سے ثبوت ملتا ہے۔ اسی بنا پر بار بار ان کی ترجیحات بدلتی رہیں۔ ہر منصوبے کے لیے وہ ایک بلند کوش تصور قائم کر لیتے تھے اور ہر کام کو وہ اس کے کمال تک لے جانے کے درپے رہتے تھے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ان کا شمار ایک تکمیل پسند PERFECTIONIST کے طور پر

کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ذوق کے کلام کی چھان بین اور اس کی فراہمی بھی اتنی آسان نہ تھی۔ جو بیاض اور مسودے دستیاب ہوئے وہ بھی یا تو صاف نہ تھے یا ادھورے تھے۔آزاد نے کئی جگہ ان مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے گزشتہ مجموعوں سے اپنی عدم تشفی ظاہر کی ہے۔ وہ اپنے استاد کے شایان شان ایک مکمل اور مبسوط دیوان کے تصور کو عمل میں لانا چاہتے تھے۔

آزاد نے جو دیوان ترتیب دیا وہ گزشتہ مجموعوں اور بیاضوں سے نہ صرف یہ کہ ضخامت میں زیادہ تھا، ان تکلیف دہ فردگزاشتوں سے بھی خالی تھا جو دوسری اشاعتوں میں ملتا ہے۔ کلام ذوق کے ماخذوں میں 'دہلی اردو اخبار' کی روایت کے مطابق چار خاص تھے۔

1. آزاد کا حافظہ، بقول ان کے انہیں اپنے استاد کا خاصا کلام ازبر تھا۔
2. وہ مواد جو ذوق کے بیٹے خلیفہ محمد اسمٰعیل سے دستیاب ہوا۔
3. وہ مسودے اور بیاض جو خود ان کے پاس محفوظ تھی۔
4. ذوق کے دوسرے شاگردوں کی بیاضیں یا نسخے۔

'دیوانِ ذوق' میں وہ پہلے ہی یہ واضح کر دیتے ہیں:

> ''پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ بہت تحریریں بہت کچھ میری قسمت کے فرشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا اس زمانے کے حالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے، جب یہ مہم سر ہوئی''۔

اس اقتباس کی روشنی میں یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور حافظ محمود شیرانی دلائل اور تفصیل کے ساتھ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں جہاں شعر نامکمل تھے یا کوئی غزل مکمل صورت میں

نہیں تھی یا جہاں تہاں الفاظ مسخ ہو گئے تھے اور بے ربطی واقع ہوگئی تھی۔آزاد نے اپنی ذہانت سے ان کمیوں کو پورا کیا ہے۔خود آزاد کی زندگی میں ان پر اس قسم کے الزام لگائے گئے تھے۔جن کی تردید میں انہوں نے 'کوہ نور' کے مدیر کو بھی خط لکھا تھا جس کا حوالہ جہاں بانو نقوی نے دیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے دس ماہ تک دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر استاد کے نام سے شائع کرتا ہوں اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شائع کرتا''۔

آزاد کی اس وضاحت کے بعد بھی وہ شبہات جوں کے توں قائم رہتے ہیں جو داغ یا دوسرے معاصرین کے بعد شیرانی نے لگائے ہیں۔حافظ محمود شیرانی خود ایک اعلیٰ پائے کے محقق تھے۔انہوں نے جو تفصیلات مہیا کی ہیں ان سے صرف نظر یوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آزاد نے جو کچھ ترمیم اور اضافے کیے ہیں وہ اس عہد تک شاگردوں سے بعید نہ تھے۔2 تنویر احمد علوی بھی محمود شیرانی کی توضیحات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''مولانا کی زندگی میں جن اضافات پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے اور جن کی حقیقت سے مولانا نے قطعی طور پر انکار کیا ان کے بارے میں موجودہ دور کے بعض محققین نے جن میں حافظ محمود شیرانی کا نام سرفہرست ہے کچھ ایسے ثبوت بھی فراہم کیے ہیں جن سے ان اضافوں کی حقیقت بہت کچھ واضح ہو جاتی ہے۔پروفیسر شیرانی نے مولانا کے اپنے کاغذات سے 'دیوان ذوق' مرتبہ آزاد میں شامل بعض اضافی غزلوں کے ایسے مسودے بہم پہنچائے جو مولانا کی اپنی فکر فرمائیوں کے مرہونِ منت ہیں''۔

(دیوانِ ذوق۔مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صفحہ 48-47)

باوجود اس کے آزاد کی محنت وجگر کاوی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔آزاد کے الحاقات

سے قطع نظر یہی وہ دیوان ہے جس نے کلام ذوق کے ان مرتبین کے کام کو نسبتاً آسان بنا دیا جن کا سلسلہ آزاد کے بعد تنویر احمد علوی تک پہنچتا ہے۔

حواشی

۱ ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے کہ ان کی دیوانگی کی وجوہات میں اس شبانہ روز محنتِ شاقہ کا بھی دخل تھا جو انہوں نے 'دیوانِ ذوق' پر کی تھی۔ آگے چل کر مولوی خلیل الرحمٰن کا حوالہ بھی انہوں نے دیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

> ''اس پر قیامت یہ ہوئی کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب شروع کر دی۔ اس میں دن رات کا انہماک و استغراق رہا۔ راتوں اسی ادھیڑ بُن میں لگے رہتے۔ استاد کی غزلیں پوری کرتے (مولوی صاحب کا یہ جملہ غور طلب ہے) گرمیوں میں اس پر محنت زیادہ ہوئی۔ نیند میں کمی آ گئی۔ دیوان تو جوں توں کر کے چھپ گیا مگر مراق کی کیفیت پیدا ہو گئی۔''

۲ ڈاکٹر تنویر احمد علوی بھی متنی تصرفات کے بارے میں شاگردوں کے رول کو عین اندر امکان بتاتے ہوئے آزاد کے متن کو قطعاً معصوم قرار نہیں دیتے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مولانا کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنے استاد کے کلام میں اضافہ کریں۔ میرے خیال سے ان اضافوں اور اصلاحوں کی کئی وجہیں ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو وہ جوش ارادت و خلوص ہے جس کی وجہ سے بعض مریدوں نے اپنی تصانیف اپنے مرشدوں کے نام منسوب کر دیں یا بعض استادوں نے اپنی شعری تخلیقات اپنے تلامذہ کو بخش دیں جس کی گوناگوں مثالیں ہماری ادبی تاریخ میں بھی موجود ہیں۔ ایک اور نفسیاتی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مولانا کے خیال سے جو کلام باقی رہا وہ دریا میں قطرے سے بھی کم ہے جس سے ان کے استاد کی سخن ورانہ حیثیت پر حرف آتا ہے۔ ایک خاص وجہ استاد کی شاعری کے قدیمانہ رنگ پر اعتراض کو قرار دیا جا سکتا ہے جو مولانا آزاد کی زندگی ہی میں سامنے آنے لگے تھے۔ محاورے کے اندازِ استعمال پر بھی بعض لوگ معترض تھے۔ متروکات کی تعداد بھی معاصرین کے مقابلے میں ان کے یہاں کچھ زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ اس خط سے بھی ہوتا ہے جو حافظ ویران نے مولانا محمد حسین آزاد کو لکھا ہے اور جس میں اس طرح کے اعتراضات پر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے۔''

نظم آزاد

آزاد بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ ذوق جیسے استاد نے ان کی ذہنی تربیت کی تھی۔ آزاد کی نظر میں ذوق کا بہت بڑا مرتبہ تھا۔ ذوق کی شان میں انہوں نے ''آبِ حیات'' ہی میں مدح سرائی نہیں کی تھی بلکہ ایک طویل قصیدہ بھی لکھا تھا۔

ذوق روایتی مضامین کے بڑے دلدادہ تھے۔ روایتی مضامین کی تکرار اتنا بڑا عیب نہیں جتنا انہیں روکھے پھیکے طریقے سے دہرانا۔ ان میں مشکل ہی سے ان کی ذات کا کوئی عکس نمو پاتا ہے یا آشوب زیست کی کوئی جھلک یا جذبے کی کوئی چمک دکھائی دیتی ہے۔ داخلی کیفیتوں کے فقدان کے باعث وہ اپنا کوئی انفرادی رنگ نہیں پیدا کر سکے۔ یہ غزلیں ذوق کے باطن کا کوئی سراغ فراہم نہیں کرتیں۔ شاعرانہ مضامین اور برتے ہوئے شاعرانہ جذبوں اور خیالات کو غیر شاعرانہ پیرائے میں ڈھالنا انہیں خوب آتا تھا۔ عروض، آہنگ اور بیان کے اعتبار سے ذوق کی غزل کا اپنا ایک نفیس کردار تھا۔ وہ نام کے استاد نہ تھے، فن شاعری کی تمام نزاکتوں اور باریکیوں سے آگاہ تھے۔ اور صنائع اور بدائع کے استعمال میں انتہائی محتاط واقع ہوئے تھے۔ غزل کے بجائے قصیدے کی صنف ان کی قادرالکلامی کی ایک قابل قدر مثال تھی۔ آزاد نے کم وبیش بیس برس ذوق سے شعری تربیت حاصل کی تھی۔ لیکن وقت کچھ اور ہی کروٹ لے رہا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی روایتی طرز ہائے سخن پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا تھا۔ وقت اور سیاست کے تقاضے کچھ اور تھے۔ جسمانی پسپائیوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی پسپائیاں بھی پوری قوم کا مقدر بن چکی تھیں۔ سو آزاد بھی ادھر چلے جدھر کو ہوا چلی۔ آزاد کی شاعری کے دو رنگ واضح ہیں۔

(1) روایتی غزلیں، جن پر ذوق کے طرز کلام کا گہرا اثر ہے۔
(2) نظم کے نئے تجربے، جو ''نئے'' صرف اس لئے تھے کہ نئے موضوعات پر مبنی تھے۔ اکثر نظموں میں تسلسل کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

☆

حالی کی طرح آزاد کے ذہن میں بھی نئی شاعری کا جو تصور قائم ہوا تھا، وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی تھا۔ آزاد حالی سے کچھ زیادہ انگریزی جانتے تھے اور انہوں نے حالی سے زیادہ بعض انگریز افسروں اور اساتذہ کی صحبتیں اٹھائی تھیں۔ حالی سے قبل انہوں نے نئی نظم کا تصور دیا تھا۔ حالی کی وہی نظمیں کلام موزوں کا درجہ رکھتی ہیں جو فارسی حکایات پر استوار ہیں اور جن کا مقصد محض اخلاق آموزی ہے۔ آزاد طبعاً رومانی واقع ہوئے تھے۔ اصلاح کے مقصد کو انہوں نے اظہار کی منطق پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ لیکن ان کے اپنے محسوس تجربات کا کم ہی کوئی عکس ان کی نظموں میں بار پاتا ہے جبکہ حالی کی اکثر غزلوں اور نظموں میں دل کی دردمندی لفظوں میں حل ہو کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ آزاد کی اکثر نظمیں ذوق کے قصائد کی زبان اور قصائد کی فضا کی مظہر ہیں۔ ذوق کی قادرالکلامی کے سامنے آزاد بہت کوتاہ پڑ جاتے ہیں۔ قادرالکلامی آزاد کی نثر کا ایک نمایاں وصف ہے۔

☆

آزاد کی غزل کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ کہیں رعایت لفظی کا اہتمام ہے تو کہیں روزمرہ کا لطف پیدا کرنے کی کوشش ایسی مثالیں کم سے کم ہیں۔ جو خیال افروز ہوں یا جنہیں حیات و کائنات کے تعلق سے کسی فلسفیانہ تاثر کا حامل قرار دیا جا سکے۔ جن جذباتی سانحات نے ان کے وجود کو ناقابلِ برداشت صدموں سے دوچار کر دیا تھا اور تاریخ کی جو آزمائشی ساعتیں ان کا مقدر بن چکی تھیں ان کے تقاضوں سے آزاد کی غزل یکسر عاری ہے۔

نہیں لاتے تھے جو خاطر میں مجھ کو اے تری قدرت
انہیں کو اب مرے ملنے کے ارماں ہوتے جاتے ہیں

مرا سینہ بھی کم گنج شہیداں سے نہیں قاتل
شہید اس میں ترے ہاتھوں ہوئے ارمان کتنے ہیں

قدم قدم پر نظر چاہیے چلے ہو کہاں
لگائے بیٹھا کوئی دیکھنا! کمیں تو نہیں

محتسب بہر خدا دستِ ستم کر کوتاہ
ہو نہ قلقل کے عوض نوحہ گری شیشہ میں

کہا تبسم زیر لبی میں کیا ساقی
ہنسا جو منہ لب مینا پہ رکھ کے جام بہت

ہمارے دل کو تو دلدار تک ہے دلداری
جو وہ نہ دل کو سنبھالے تو دل کہاں اپنا

غزلیہ شاعری کے مقابلے میں آزاد کی مشکل پسند طبیعت کا سراغ قصائد سے زیادہ ملتا ہے۔ ان قصائد میں بھی ذوق وسودا ہی کے مضامین کی تکرار زیادہ ہے لیکن وہ محض نقل آرائی بھی نہیں ہے۔ آزاد نے خیال آرائی بھی کی ہے، نئے نئے لفظی خوشے بھی خلق کیے ہیں۔ تشبیہات اور استعارات میں ندرت بھی پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ اس نواح میں آزاد کا آہنگ بھی بلند ہے، قصیدے میں جسے ایک وصفِ خاص کی حیثیت حاصل ہے۔

قصیدہ درتہنیت ولادت جناب امیرالمومنین علی ابن طالبؓ کی تشبیب کے یہ اشعار یک لخت سودا اور ذوق کی فن کارانہ چابک دستی کی طرف ذہن کو رجوع کرتے ہیں۔

نہ ہیں خزائن قاروں نہ ملک دقیانوس   نہ بوستانِ ارم ہے نہ قصر ذاتِ عماد
نہیں فساد سے خالی کبھی یہ دار حدوث   کیا ہے عالم فانی بنائے کون وفساد

ہوا کے گھوڑے پہ جاتے ہوں جو سلیماں وار ہوں دم میں فرشِ زمیں جوں سطیح مادرزاد
کہاں ہے لشکرِ عاد اور کہاں ہے قوم ثمود کہاں ہے لشکر فرعون وجاہ ذی الاوتاد
کہاں ہے مملکتِ بخت ونصر واسکندر کہاں ہے شوکتِ ماہان ونخوت شداد

یہ ایک طویل قصیدہ ہے جس میں آزاد نے زبان دانی کے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ ذوق کی طرح اپنی علمیت کا بھی خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ قصیدۂ در مدح اکبر شاہ ثانی تو ذوق ہی کی مقبول بحر میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے لفظی خوشے بھی سر بہ سر ذوق کے طرز کلام کی یاد دلاتے ہیں۔

صبحِ سعادت، نور ارادت، تن بہ ریاضت، دل بہ تمنا
جلوہِ قدرت، عالم وحدت، چشم بصیرت، محوِ تماشا
قصرِ رفیع وصحن وسیع وطرز مسجع، سطحِ مربع
باغ ارم یا روضۂ رضواں ، خلد بریں یا جنت ماویٰ
مرغ خوش الحاں، برسر بستاں، ہر گلی بستاں، خرم وخنداں
گوشِ حقائق محو سرود ودیدہِ نرگس، مستِ تمنا
فصلِ ربیع وموسمِ اروی، معتدل یک جا گرمی وسردی
میلِ عناصر، سوئے طبائع، ربط قویٰ بہ، عالم اشیا
چہرۂ گلشن، آتش رخشاں، سرخی گل میں، لعل درخشاں
سبزہ بہ شبنم، رشکِ جواہر، لالہ بہ ژالہ، لولوئے لالہ

ایک قصیدہ ذوق کی مدح میں بھی ہے۔ آزاد کے ان قصائد میں جو صناعی اور فنکاری ہے اور جس طرح مضمون آرائی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس سے آزاد کی مشاقی ظاہر ہوتی ہے اگر دربارداری اسی طرح برقرار رہتی اور کلاسیکی روایات کا سلسلہ جوں کا توں قائم رہتا تو یقیناً اس سلسلے کی توسیع میں آزاد کا بھی ایک بڑا حصہ ہوتا اور قصیدے کی تاریخ میں ذوق کے بعد آزاد بھی ایک اہم شاعر کے طور پر شمار کئے جاتے۔ مذکورہ قصیدے کے چند اشعار دیکھیں:

ترکیب دے کے لفظ ومعانی کو ہم دگر — میں زور کیمیا میں دکھاتا ہوں زرگری
پر ہائے کیا کروں کہ زمانہ نہیں رہا — وہ نکتہ ور ہیں اب نہ ہے وہ نکتہ پروری
ہوتے مرے قصیدے تھے شاہوں کے سر کے تاج — روشن تھے جن سے جوہر پاکیزہ گوہری
میں ڈھالتا تھا رات کو جو تاج زرنگار — رکھتا تھا سر پہ صبح کو خورشید خاوری
دیتا جو طرہ ہائے جو اہرنگار میں — ہوتے تھے بہر اہل دَول تاج سروری
زیور کو میرے دیکھو تو اک اک رقم سے دے — صد گونہ حسن وناز بہ خوبان آذری

درج ذیل قصیدہ ذوق کی مدح اور یاد میں ہے۔آزاد نے سارا زور لفظی صناعی، آہنگ کی بلندی ،علمیت کے مظاہرے اور ظاہری آرائش وزیبائش پر صرف کردیا ہے۔ایجاز کی جگہ تفصیل، تجرید کی جگہ توضیح اور بے ساختگی کی جگہ تکلف سے پر کی گئی ہے۔شعر بنانے کا یہ طور قدیم سے چلا آرہا ہے۔جس کی ایک انتہا جوش کے یہاں دیکھی جاسکتی ہے۔باوجود اس کے آزاد نے اپنے استاد ذوق کے شاعرانہ کمال کا جس عقیدت مندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔وہ قابل قدر ہے۔

بہ قید مدرسہ نو سال اس طرح گزرے — کہ جیسے بند قفس میں ہو بلبل مخروں
بہ صرف ونحو ومعانی گہے بہ علم ادب — گہے بہ علم لغت ہوتا شوق دل تھا فزوں
کبھی صحاح تھی پیش نظر کبھی قاموس — محاورات عرب پر زِبس تھا دل مفتوں
گہے بہ علم حدیث وگہے بہ علم اصول — گہے بہ فقہہ وفرائض تھی طبع راہ نموں
بڑھے ہمیشہ فتاوائے ملت حنفی — کہ ہووے آگہی فرض، واجب ومسنون
گہے بہ سوئے قرأت اور گہے بہ رسم الخط — گہے بہ علم تفاسیر دل سے تھا مفتوں
گہے بہ فلسفہ گاہے بہ منطق وحکمت — گہے بہ سیر کواکب تھی طبع راہ نموں
کبھی نہ بحث ہیولا وجسم تعلیمی — ہو افلاسفے کی طرح خلق میں مطعوں
کبھی تھی بحث مجسطی وشرح چغمینی — زباں پہ زیج الغ بیگ کا رہا مضموں
وہ ذوق جس کا ہے ثانی جہاں میں ناممکن — بہ زیر گنبد گردان وچرخ نیلی گوں

زِبس کہ خنجر غم سے فگار ہے سینہ
تو تیر آہ نکلتا ہے دل سے غرق بہ خوں

آزاد کی نظم گوئی:

حالی اور آزاد نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس امر کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ وہ انگریزی زبان وادب سے کم ہی واقف ہیں۔ جہاں تک مغربی ادب اور وہاں کی ادبی تحریکات ورجحانات کا تعلق ہے، حالی اور آزاد کے ہم کار انگریز اساتذہ اور افسران کو بھی ان کا علم یا تو قطعی نہ تھا یا بے حد سرسری واقفیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں اپنے معاصر ادوار میں رونما ہونے والی ادبی تبدیلیوں سے بھی آگہی نہ تھی۔ فرانس میں حقیقت نگاری (ریلزم) فطرت نگاری (نیچرلزم) اور علامت پسندی (سمبلزم) جیسے میلانات میں مسابقت جاری تھی۔ انگلستان میں والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ کے پہلو بہ پہلو میتھیو آرنلڈ جیسا اہم نقاد اور شاعر بھی تھا اور اخلاق آموزی کا درس ایک قصہ پارینہ بن کر رہ گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز اور اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بالخصوص ولیم بلیک کے بعد جس رومانی تحریک نے ذات کے تجربے کو خاص اہمیت دی تھی اور فطرت سے روحانی رشتہ استوار کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس کے بارے میں کہیں کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ ورڈزورتھ کا نام تو لیا جاتا ہے لیکن اس کے خیالات یا اس کی شاعری کے اصل کردار کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ آزاد اور حالی نے اپنے گہرے تخلیقی اور تنقیدی شعور کی بنا پر محض ننھی منّی سی چنگاریوں کو شعلہ بنا دیا۔

☆

آزاد نے نیرنگ خیال کے دیباچے میں اردو زبان کی کم مائگی پر اظہار تاسف کیا ہے۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں (مراد انگریزی سے ہے) کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ''ہر ایک زبان اپنے اپنے ملک کی خدمتیں لے کر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پر قائم ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری زبان کس درجے پر کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت ادنیٰ درجہ پر ہے''۔ اردو زبان کے سلسلے میں آزاد کا یہ تصور قطعی بے بنیاد ہے۔ جو ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز نہیں ہے۔ اس طرح کے خیالات کے پیچھے

بہت سی مصلحتیں کارفرما تھیں۔ آزاد تو محض ایک مہرے کے طور پر کام کر رہے تھے۔ حالی[1] کے مقابلے میں وہ مجبور بھی تھے اور کئی برسوں تک ان کی وفاداریاں مشتبہ بھی تھیں۔ آزاد کے مذکورہ بیان میں اردو شعروادب کی حیثیت مقدر کی ہے۔ آگے چل کر وہ واضح کرتے ہیں کہ ''بڑی قیامت یہ پیدا کی کہ ارباب زمانہ نے متفق اللفظ یہ کہہ دیا کہ اردو نظم مضامینِ عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ بڑا داغ ہے جو ہماری زبان پر لگا ہے۔'' پہلی بات تو یہ کہ آزاد یا ان سے قبل یہ دعویٰ کس نے کیا تھا؟ انگریز افسران ہی اس قسم کی تہمت لگا سکتے تھے۔ ورنہ اردو شاعری کبھی محض عاشقانہ مضامین تک محدود نہیں رہی۔ جو شعرا محض ''حسن وعشق'' کے جذبوں پر ہی قانع تھے اور معاملہ بندی اور وصل وہجر کے مضامین پر جنہوں نے اکتفا کر رکھا تھا۔ اردو شاعری کی تاریخ میں انہیں کبھی کوئی مناسب مقام حاصل نہیں رہا۔ پھر یہ کہ یہ جذبے اور ان سے منسلک دیگر جذبات کی اپنی ایک دائمی قدر ہے۔ یونانِ قدیم کی سیفو سے لے کر سنسکرت اور عربی شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے انہی جذبوں کی نمائندگی کے باعث ہر نسل اور ہر دور کے لئے چشمۂ حیرت واحتظاظ رہے ہیں۔ مضامین عاشقانہ کے بجائے ان شعرا پر گرفت کرنی چاہیے جن کے نزدیک جذبۂ عشق کے معنی محض ہوسنا کی کے ہیں یا جو کبھی عشقیہ وارداتوں ہی سے نہیں گزرے ہیں یا جو ان جذبوں کو لطیف پیرایوں میں ادا کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہیں۔ آزاد کے اس قسم کے خیالات انگریزی زبان وادب سے زیادہ انگریزوں سے مرعوبیت کا نتیجہ تھے۔ حالی اور آزاد دونوں کے مذاق شعر کو مشرقی شعریات ہی نے جلا بخشی تھی۔ آزاد کی غزل اور قصیدہ اسی ذوق کا مرہون ہے۔ نظموں میں دونوں کوئی قابل

---

[1] ''میر حسن، نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے بعد آزاد اردو کے سب سے بڑے منظر نگار شاعر ہیں، ان کی شاعری فلسفیانہ عمق سے پرے ہٹی ہوئی ہے۔ لیکن لفظی شان وشوکت جیسی کہ آزاد کی شاعری میں ہے، سودا کے بعد کسی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کا اثر ذوق کی شاعری خصوصاً قصیدہ نگاری کے توسط سے آزاد پر بہت بڑا تھا۔ آزاد نثر کی طرح نظم میں بھی حسنِ لفظی کے پابند ہیں..... ان کی بعض مثنویوں میں ایسے کئی ٹکڑے ملتے ہیں جن میں آزاد منظر نگاری کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس خصوص میں آزاد کی شاعری اسالیب کے اعتبار سے نظیر اکبر آبادی سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہے''۔ (جہاں بانو نقوی 'محمد حسین آزاد' حیدر آباد 1940ء صفحہ 155)

ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ حالی کی نظموں میں ان کی طبیعت کی نرمی اور ملائمیت، اخلاص اور دردمندی نے ان کے آہنگ کو بلند نہیں ہونے دیا ہے۔ زیاں کا ایک احساس، کچھ کھو جانے کا ایک دکھ، ایک عدم اطمینانی کی کیفیت، اکثر نظموں کے تحت اندر تحت کارفرما ہوتی ہے۔ ان کی یہ شعوری کوشش ہوتی ہے کہ نظم اپنے ظاہر و باطن میں ہر مکر اور ہر فنی چالاکی سے بری ہو اور لسانی چمک دمک کے بجائے اپنے موضوع و مقصد کی تطبیق کرتی ہو۔ حالی کے مقابلے میں آزاد کے یہاں لسانی زور آزمائی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ فطری مناظر کی پیش کش میں ان کی نظر محض خارج کے تاثر ہی تک محدود رہا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ جا بجا بڑی دلآویز مشابہتوں سے کام لیتے ہیں۔ ان سے بصری پیکروں کا ایک سلسلہ سا قائم کر دیتے ہیں۔ اس طرح فطرت کے مختلف اجزا کے ساتھ ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ فطرت ان کے یہاں محض نرم رخ کی مظہر نہیں جو مشفقانہ ہوتا ہے وہ اس گرم رخ کی بھی پردہ دری کرتے ہیں جس میں اذیت رسانی ہوتی ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جس کے باعث آزاد کی فطرت نگاری میں تنوع بھی پیدا ہوا اور اس یکساں روی سے بھی وہ محفوظ بھی رہے جو ان کے دوسرے معاصرین کے مشاہدے کو محدود کر دیتی ہے۔

رُخ ایک

چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر — اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی — سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آتی ادھر صبا ہے ادھر سے نسیم بھی — اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
سبزہ کے عکس سے درودیوار سبز سبز — سیراب باغ ودشت تو کہسار سبز سبز

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں — اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے — وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے
آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا — اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے — اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

دوسرا رُخ

اب یاں جو چند روز سے قانون عام ہے
گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

عالم تھا شعلہ خیز وفلک شعلہ ریز تھا
اک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا

منہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی
اور گرد چار سو تہِ افلاک اُڑ رہی

دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی
پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی

شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے
اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے

طفلِ نبات پیاس کے مارے بلک گئے
خلق خدا کے نالے بہت دور تک گئے

سیماب ہو کے سینے سے ہر دل نکل چلا
اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا

دل تشنگی کے مارے یہ بے تاب ہو گئے
انساں تڑپ کے ماہیٔ بے آب ہو گئے

(مثنوی مسمیٰ بہ ابر کرم)

☆

آزاد کے لئے ذوق کے قصائد کی زبان اور ان کی طول پسندی ہی ترغیب کا واحد ذریعہ نہ تھی، مراثی انیس میں بیانیہ کی تکنیک اور افعال سے معمور حرکی زبان اور نظیر اکبرآبادی کا بے محابا پن بھی ان کے لئے خاص کشش کا حامل تھا۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی میر حسن کے جادو کے بھی وہ اسیر تھے۔

نظیر اکبرآبادی کے لغاتِ شعری کے کینوس کے مقابلے میں آزاد بہت کوتاہ پڑ جاتے ہیں، لیکن نظیر نے واقعیت، ڈرامہ سازی، تفصیل پسندی اور منظر و پس منظر کے ایک ایک جز پر آنکھ دھرنے کی جو روش قائم کی تھی آزاد کی اکثر نظمیں ان اثرات کی چغلی کھاتی ہیں۔ اس ذیل میں مثنوی زمستاں کا یہ ٹکڑا دیکھیں۔

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا
اور بغل سے دل وحشت زدہ نکلا جاتا

یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے
آگ ہاتھ آئے تو ہیں دل میں چھپائے لیتے

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا
پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا

اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے

کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے
لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے

کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں
ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں

کہیں سو، سو، کہیں سی سی کہیں سیٹھی ہے
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے

حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے
رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے حالی کے

اس کی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے
پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے

خلق سے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی
تن تو ٹھنڈے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی

ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں
دل میں ہے آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں

نظیر[1] کی طرح آزاد کی نظر بھی زندگی اور حقیقت کے ایک ایک پہلو کو کسب کرنے کے درپے رہتی ہے۔ وہ رکنا اور ٹھہرنا تو جانتے ہی نہیں۔ بیان کو بیانیہ کا رنگ کس طرح دیا جا سکتا ہے اور واقعے کو کس طرح حکایت کے طور پر ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس ہنر کا شائبہ نظیر کے بعد آزاد ہی کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ نظیر کے دائرے میں چیزوں اور رنگوں کا اژدہام ہے جب کہ آزاد کے دائرہ مقابلتاً تنگ ہے۔ نظیر فنافی الشعری تھے، آزاد کی ترغیبات کے کئی محور تھے۔ شاعری سے زیادہ نثر سے ان کے ذہنی اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل ہوتی تھی، سو شاعری کی دیوی جس کا مطالبہ ہی مکمل سپردگی ہوتا ہے۔ جزوقتی شعرا پر کم ہی ملتفت ہوتی ہے۔ آزاد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ نہ تو اپنے عہد کے سیاسی انتشار کو کوئی نام دے سکے اور نہ اپنے داخلی زخموں کو زبان دے پائے۔ حتی کہ اپنے والد کی موت پر بھی کوئی رثائیہ نظم نہ لکھ سکے۔ اور نہ نثر (مکتوبات وغیرہ) میں کسی ردِ عمل کا اظہار کر پائے۔ باہر کے اجبار نے انہیں مستقل ایک گھٹن میں محبوس کر رکھا تھا۔ اسی حبس مسلسل کا نتیجہ تھا کہ آخری 20 برس جنون کے عالم میں گزرے اور اسی عالم میں ان کی وفات ہوئی۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے اس ضمن میں لکھا ہے:

"اپنے والد کی پھانسی سے لے کر کیفیاتِ جنون تک آزاد جس

خونی اور محبوس ماحول میں سانس لیتے رہے اس کے بیان سے ان کی شاعری نے اغماض برتا ہے۔ اگر ان کی شعری ذات کا پتھر گویا ہو جاتا اور ان کا خیال پا در گل رہنے کی بجائے متحرک ہو جاتا یا وہ ماضی کو حال میں اور حال اور ماضی کو مستقبل میں دیکھ پاتے تو ان کی شاعری زندہ اور متحرک شاعری ہوتی۔ پُر اضطرار بھی ہوتی اور پُر اضطراب بھی۔ واقعیت کا سرچشمہ بھی ہوتی اور امکان کا سمندر بھی۔ آزاد کی کیفیتِ جنون ان کی شعری ذات کا حقیقی اظہار تھی۔ اگر وہ کوائف کے اس مجموعے کو جس کا نام ان کا جنون تھا وقتاً فوقتاً سپردِ قلم کرتے رہتے تو انہیں اپنے موضوع پر اختیار بھی رہتا اور ان کی شخصیت بھی مجتمع رہتی۔''[1]

یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ 'خواب امن' دادِ انصاف اور وداع انصاف جیسی مثنویاں در پردہ آزاد کے ناراست ردعمل ہی پر منتج ہیں وہ ایک شکست خوردہ، بے بضاعت اور نحیف ونزار قوم ہی کے ایک فرد تھے جو مقابلہ کرنے کی ساری اہلیت گنوا چکی تھی۔ لیکن ان کی وہ آواز جو ایک تیز رَو کی مانند دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹ نکلی تھی اسے ''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' میں دیکھا جا سکتا ہے، یہ نظم ''دہلی اردو اخبار'' کے 24/مئی 1857ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ جس کی تمہید میں وہ کئی سلاطینِ جہاں دار کی سطوت وشوکت کا ذکر کرتے ہیں، پہلو بہ پہلو لقمان وافلاطون کی دانش وبینش اور ان کے علم وحکمت کے حوالوں کو موضوع بناتے ہیں اور پھر ان کے زوال کے مقدرات پر یہ کہہ کر اپنی مہر ثبت کر دیتے ہیں کہ:

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ یک چشم زدن میں
ہاں دیدہ ودل کھول دے اے صاحبِ ابصار

''گریز'' کے اس شعر کے بعد قومِ نصاریٰ کے عروج اور پھر باغیوں سے ان کی مجادلت کا ذکر آتا ہے۔ جسے وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر سعادت سعید ''فن اور خالق'' دستاویز مطبوعات۔ لاہور 1998ء صفحہ 105

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ تھی صاحبِ اقبال وجہاں بخش وجہاں دار
تھی صاحبِ علم وہنر وحکمت وفطرت تھی صاحبِ جاہ وحشم ولشکر جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے آفاق میں تیغِ غضب حضرتِ قہار
سب جوہرِ عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے سب ناخنِ تدبیر وخرد ہوگئے بے کار
کام آئی نہ علم وہنر وحکمت وفطرت پورب کے تلنگیوں نے لیا سب کو یہاں مار

ظاہر ہے یہ لمحۂ تعطل، محض ایک بھرم ثابت ہوا۔ ایک لہو رنگ کہانی پر سے ابھی پردہ اٹھنا باقی تھا۔ ایک انتشار آ گیں اور بے مرکز باغیوں کی فوج اور اس کے حامیانِ شہر کو پھر ایک دریائے آتش وخوں سے گزرنا تھا۔ سو وہ گزرے اور ایک انتہائی الم ناک انجام کو پہنچے۔

کہنے کا مقصود یہ کہ مولوی باقر کے بعد 21 اہل خاندان کی کفالت اور تحفظ کا سارا باران کے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ ماضی کی تمام مجلسیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ حال انتہائی مایوس کن اور حوصلہ شکن تھا۔ مستقبل میں ایسی کوئی رمق کوئی چمک دکھائی نہیں دے رہی تھی جو تیرۂ وتار حال کا سدِ باب کر سکے۔ آزاد کے لیے 'زباں بندی' ہی ایک راہِ عافیت تھی، سو انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زبانِ خاموش کو ترجیح دی اور پرکھوں کی سرزمینوں کو خیر باد کہہ کر لاہور میں خیمہ زنی اختیار کر لی۔

محولہ نظم آزاد کے اس ذہنی رجحان کا بخوبی پتہ دیتی ہے۔ جو اہلِ فرنگ کی غاصبانہ حکمت عملیوں کا ایک فوری اور جذباتی ردِ عمل تھا۔ بعد ازاں وہ اپنے ان جذبوں کو پھر کبھی لب گویا عطا نہ کر سکے۔ ڈاکٹر سعادت سعید بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''آزاد کی شاعری میں اگر ان کے وجود اور ذات کے مسائل اظہار پاتے تو بلا مبالغہ وہ اس دور کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ اپنی کشمکش زندگی میں آزاد جن تجربات سے گزرے ہیں وہ ایک حساس اور باضمیر فرد کی شخصیت کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے کافی تھے۔ شاعری کے قارئین کے لیے اگر کوئی دکھ کی بات ہے تو یہی کہ محمد حسین آزاد

اپنے پیچیدہ اور گوناگوں تجربات کو شاعری کی زبان نہیں عطا کر سکے۔
معروضی منظر نگاری پر ان کی گرفت مضبوط رہی لیکن ذاتی اور داخلی
منظر نگاری کا مسئلہ پردۂ اظہار ہی میں مخفی رہا''۔ [1]

☆

اردو شاعری کی تاریخ میں مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ ایک اہم اور قابل ذکر شاعر کے طور پر شاید نہ کیا جائے، لیکن جدید نظم کے بنیاد گزار کی حیثیت سے اساساً ان کی جدوجہد ناقابلِ فراموش ہے۔ سرسید اپنی بعض تحریروں میں تصنع آمیز زبان اور غیر حقیقی جذبوں پر استوار مضامین کی روایت اور رسمی تکرار کے خلاف پہلے ہی آواز بلند کر چکے تھے۔ لیکن سرسید کا مشن وسیع المقاصد دستور کا حامل تھا۔ ان کی جنگ کے محاذ چاروں طرف کھلے ہوئے تھے۔ ادب سے زیادہ قومی اور تہذیبی اصلاح کے مقصد کو انہوں نے اوّلیت کا درجہ دے رکھا تھا۔ سرسید نے ادب کی اصلاح کا کام حالی کے سپرد کر رکھا تھا۔ لیکن حالی سے قبل آزاد یہ بیڑہ اٹھا چکے تھے۔ ڈاکٹر لائٹز محمد حسین آزاد کی ادبی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے، لیکن انہیں نئی شاعری اور اس کی زبان کی طرف متوجہ کرنے کا سہرا کرنل ہالرائیڈ کے سر ہی جاتا ہے۔ انہیں کے ایما پر آزاد نے اپنی ترغیبات کا رخ نئی نظم کی نظریہ سازی کی طرف موڑ دیا۔ یوں تو انجمن اشاعت علوم مفیدہ (بعد ازاں جس کا نام انجمن پنجاب ہو گیا) کا قیام 20/جنوری 1865ء کو عمل میں آ چکا تھا۔ مگر اسے صحیح معنیٰ میں ایک خاص مقصد تفویض کیا آزاد نے۔ جنہوں نے 1865ء سے 1886ء تک انجمن کے مختلف جلسوں میں تقریباً 22 مقالات پڑھ کر سنائے تھے۔ انہوں نے اپنا وہ یادگار خطبہ موسوم بہ خیالاتِ نظم اور کلام موزوں کے باب میں، اگست 1867ء کے جلسے میں پیش کیا تھا۔ جدید شاعری کی تاریخ میں جسے ایک مستقل حوالے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے کلام موزوں یا منظوم کے لیے یہ شرط بھی رکھی کہ وہ موثر بھی ہو۔ نظم، نثر کی نسبت زیادہ اثر کار ہوتی ہے۔ شاعری،

---

[1] ڈاکٹر سعادت سعید ''فن اور خالق'' دستاویز مطبوعات۔ لاہور 1998ء صفحہ 105

مصوری ہے، جس کا کوئی ایک رنگ نہیں ہوتا، جو دماغ ہی کو نہیں روح کو بھی سرشار کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ آزاد کے نزدیک شاعری ایک سعادت ہے جسے وہ روح القدس کا پرتو یا فیضانِ ربّی سے موسوم کرتے ہیں۔ جس طرح افلاطون نے عاشق، مجنون، شاعر اور پیغمبر کو ایک ہی زمرے میں رکھا تھا کہ جنون کی کیفیت ان میں قدر مشترک کے طور پر کارفرما ہوتی ہے۔ آزاد بھی شاعر اور عاشق کو ان کے غیر تعقلی میلان کے باعث ایک ہی صف کا شمار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شاعری سے افادیت کی توقع فضول ہے۔ اردو شاعری پر فارسی کے اثرات کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> ''تعجب ہے کہ اس نے (فارسی نے) اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے۔ انہیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چمپا چمیلی کی خوشبو بھول گئے۔ ہزاروں بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ ان کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم و اسفندیار کی بہادری، کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی، جیحوں سیحوں کی روانی نے یہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری، ہمالہ کی ہری بھری پہاڑیاں، برف بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو روک دیا''۔

آزاد نے استعارہ، تشبیہ اور اضافتوں کو فارسی سے اختصار کے ساتھ اخذ کرنے اور بھاشا سے اصلیت اور سادگی کا فن سیکھنے کی بات بھی کہی اور یہ بھی کہا کہ انہیں خواص پر ہمیں قناعت نہیں کرنی چاہیے۔ وقت کا تقاضا کچھ اور کہتا ہے۔ ان کا اصرار یوروپ کی زبانوں اور ان کے ادب کے محاسن کی طرف توجہ دینے پر تھا کہ یک لسانی کے بجائے دولسانی ہونے پر ہی اردو ادب میں نئی زندگی کی لہر دوڑ سکتی ہے۔ آزاد کی گفتار کا یہ تو ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو وہ ہے جب انہیں یاد آتا ہے کہ ہماری روایات کی تاریخ اتنی کوتاہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جو ایک ثروت مند وراثت ہمیں سونپی ہے اسے اور متمول کرنے کے بجائے چند مخصوص اسالیب و مضامین کی باز آفرینی ہی پر ہمارا

سارا زور صرف ہو رہا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو آزاد ہی نہیں حالی کی تنقید کا بھی نشانہ بنا۔ ہمیں آزاد کے ان خیالات کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے:

''یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں، اس نے اپنے بزرگ سے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پرانے ہو گئے اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔

تم اپنے ملک کی نظم (یعنی اردو شاعری) کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹانا چاہتی ہے اور تمہیں درد نہیں آتا۔ اپنے خزانے اور نئے توشہ خانے سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔

مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور، مضمون کا جوش وخروش اور لطائف وصنائع کا سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔''

ان خیالات کے بین السطور میں آزاد کی اس ذہنی صورتِ حال کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے جو میمنہ اور میسرہ کی کشمکش مبتلا ہے۔ آزاد کی انشا پردازی، شبیہہ سازی، اسمائے صفات کے بالتکرار اور متواتر استعمال وغیرہ میں اردو کی اسلوبی روایت کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد کی ذہنی تربیت جس ماحول اور جن اساتذہ کے درمیان ہوئی تھی ان

کی روح میں مشرقیت رچی بسی ہوئی تھی۔ انہیں سے آزاد کو ورثے کے طور پر شعری روایات کا اثاثہ بھی ملا تھا۔ جس کی وقعت و عظمت کا انہیں پوری طرح احساس تھا۔ یہ احساس حالی کی بعض تحریروں کے بطن میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔[1] روایت کے اندر ہی امکانات کی جو ایک رو ہوتی ہے اس سے بے توجہی اور بے خبری نے..... جس طور پر شاعری سے نمو پذیری کی قوتوں کو سلب کر دیا تھا اور طبع موزوں کے نام پر جس طرح کی یکساں روی شاعری میں در آئی تھی۔ حالی اور آزاد کی مایوسی کے اسباب بھی اسی صورت حال میں مضمر تھے۔ وہ اپنے معاصرین سے کچھ اور ہی توقع رکھتے تھے۔

☆

توقع کے نام پر اگر آزاد مغرب کی طرف دیکھتے ہیں تو اسے خواہ ان کی کم علمی قرار دیں یا نو آبادیاتی جبر، یہ ایسا کوئی غلط اقدام بھی نہ تھا۔ آج اگر مغرب خیام کے بعد حافظ اور رومی پر دیوانہ وار جان چھڑک رہا ہے اور مشرق کے تہذیبی ایوانوں میں فکر و دانش کے جو حیرت بینر جواہر چھپے ہوئے ہیں، ان کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہے۔ اسے کیا نام دیا جائے گا۔ انسانیات کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ بنی نوعِ انسان ہمیشہ ایک دوسرے کی آگاہیوں سے متفیض ہوئی ہے اور ہر تہذیب دوسری تہذیب سے متصادم بھی ہوئی ہے۔ مرعوب بھی اور متاثر بھی۔ اخذ و قبولیت کی سلسلہ بندی میں کبھی کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔ اگر تاریخ کے کسی ثانیے میں ست روی پیدا ہوئی ہے تو اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ اخذ و قبولیت کے جاری عمل پر کوئی قدغن لگ گئی ہو۔ ست روی محض ایک ماندگی کا وقفہ ہوتا ہے۔

---

[1] ''مجھ کو مغربی شاعری سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے اور نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے۔ (حالی کا یہ بیان توجہ طلب ہے) ہو بھی نہیں سکتا، البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ و اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس ایک بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عائد ہو''۔ (مجموعۂ نظم حالی۔ دیباچہ صفحہ 2)

☆

اکثر نئی چیز معنی کا ایک نیا جہان رکھتی ہے۔اس کی نامانوسیت ہی میں توجہ خیزی کے کئی اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ اس نامانوسیت میں کمی بھی واقع ہوسکتی ہے لیکن یہ ہر تجربے کے ساتھ نہیں ہوتا۔ غالب کی نامانوسیت میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ غالب نے کوئی صنفی تجربہ نہیں کیا تھا۔ آزاد ایک نئی صنف کا ڈول ڈال رہے تھے۔ان کی نظم ایک تجربہ تھی، جس کا اپنا ایک نیا پن تھا۔ کم ازکم ان کے معاصر عہد کے لیے وہ ایک نامانوس سی چیز تھی۔ مئی 1874ء کے منعقدہ مشاعرے کا ایک تاریخی رول ہے۔آزاد نے اسی میں اپنی پہلی نظم بعنوان ''شب قدر'' سنائی تھی۔جس کے بارے میں سید ممتاز علی نے ''نظم دلفروز'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''..... کے جوشِ طبیعت نے جو کوہِ آتش خیز کی طرح مدت سے رک رہا تھا۔مئی 1874ء میں رسمی بندشوں کو جھٹکے مار کر توڑ ڈالا اور انہوں نے بزمِ شعرا میں ایک نئے ڈھنگ کی مثنوی جس کا نام مثنوی شب قدر تھا سنائی۔ سننے والے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت وہ مثنوی مجلسِ شعرا میں پڑھی گئی تمام مجالس پر ایک سناٹا اور سکوت کا عالم چھا گیا۔ یہ پہلا دن تھا جس روز ہمارے ملک کی نئی شاعری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔'' (''نظم دلفروز'' 1899ء صفحہ 7)

''شب قدر'' مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔اس کے علاوہ دوسری نظمیں بھی قصیدے یا مثنوی کے فارم میں ہیں۔ جغرافیہ طبعی کی پہیلی، اور جذب و دوری' نام کی نظمیں نہ صرف یہ کہ معریٰ میں ہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے معریٰ ہیں انہیں اولیت حاصل ہے۔ آزاد نے 'جغرافیہ' طبعی کی پہیلی منشی ذکاء اللہ (پروفیسر دہلی کالج) کی فرمائش پر نظم کی تھی۔ دونوں نظموں کا ایک تاریخی کردار ہے اور دونوں مستقل حوالے کا حکم رکھتی ہیں۔اس لیے یہ دونوں نظمیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

جغرافیۂ طبعی کی پہیلی

ہنگامۂ ہستی کو گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک وتر عالم صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری اور کرتا ہے گل کاری

اک رنگ کے آتا ہے
سو رنگ دکھاتا ہے

اور دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خر مہرۂ رنگیں یا بلور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ وہر ساعت قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے پر ان کو نہیں پروا

ہرگز کہ یہ سب کیا ہے
اور ہے تو سبب کیا ہے

ایسے بھی مگر اکثر اربابِ بصیرت ہیں
جو کھولے ہوئے ہر دم ہیں دیدۂ عبرت کو
ذرّہ ہو کہ ہو سورج معنی ہو کہ ہو صورت
ہر جلوۂ قدرت میں سرمہ انہیں حکمت کا
سرمایۂ بینائی اور عینکِ عبرت ہے
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی جس سے کہ زمانہ کی

گرمی ہو یا سردی — یا ہووے تری خشکی
حکمت کا معمّہ ہے — قدرت کی پہیلی ہے
نقطہ ہے اگر اس میں — ہے عقدۂ سربستہ
عقدہ ہے اگر اس میں
ہے نکتۂ برجستہ

اِک سیدھی سی بات اس وقت — آئی ہے تصوّر میں
یہ وہ ہے کہ دو چیزیں — کیا ایسی ہیں دنیا میں
آپس میں جو رکھتی ہیں — پیوندِ زنا شوئی
اولاد سے جن کی سب — آباد زمانہ ہے
نقلی نہیں افسانہ — سب نے اِسے مانا ہے
اور پھر انہیں دونوں کو — دیکھو جو نظر بھر کر
ماں بیٹی کا ہے ناتا
دونوں میں نظر آتا

شورش گہہ عالم میں — پیدائشیں لاکھوں ہیں
اصلوں کی بہت نسلیں — رشتوں کے سرشتے ہیں
اِس پیچ کا پر رشتہ
دیکھا نہ سنا کوئی

آزاد بھلا ہے کون — جو آگے ترے بولے
یا بندِ گرہ کھولے — یا یہ کہ مگر تو بھی
کہہ سن کے سوال اپنا
دے آپ جواب اپنا

وہ دو کہ بہم جن میں — ہے عقدِ زن وشوہر
عالم میں ہیں دو جوہر — خشکی وتری جن سے
صنعت گہہ قدرت میں — پیدا و ہویدا ہیں

سب عالمِ جسمانی
حیوانی و انسانی
اور دوسرے رشتے سے گر غور کر و دل میں
تو دیکھ لو پانی کو جس رنگ میں جی چاہے
بادل ہو کہ باراں ہو قطرہ ہو یا دریا
شبنم سے بھی کم ہووے یا نام کو نم ہووے
اِک عرصۂ خاص اس پر گزرے گا تو دیکھو گے
خشکی کے نشاں ہوتے اس میں سے ہویدا ہیں
یا بچے ہیں جو ماں کے
آغوش میں پیدا ہیں
کیوں قبلۂ من دیکھا یہ طرفہ معمّہ ہے
کیا بوجھے کوئی پنڈت یا فلسفی وملّا
ہاں سمجھے میاں آزاد یا منشی ذکاء اللہ
سنبل ہے یہ سبزہ میں پھولوں میں چنبیلی ہے
کون اِس کو بھلا بوجھے
حکمت کی پہیلی ہے

جذبِ دوری

میرے پیارے بابا تمہیں کیوں کر ہو یقیں
جب کہ میں دیکھتا ہوں طرفِ ابرِ سیاہ
یا کہ ہوتا ہوں کھڑا سرِ سیلاب رواں
تو یہ کہتا ہے مجھے شفقوں کا ہونا
دھنکوں کی سبزی ہلکے پھلکے بادل
کیا اڑے جاتے ہیں یا یہ تھے یا وہ گئے

نہیں دم لیتے ذرا — تھے کہیں پہنچے کہیں
کیا انہیں بھی ہے خبر — کہ ہے اِک طرفہ جگہ
کہ جہاں کوئی جہاز — اب تلک پہنچا نہیں
آہ ابر، آہ ہوا — خوب ہی دے گئے تم
شوق دل کو ہے مرے — جوشِ دل کا طوفاں
کہ ہے غم کی میراث — نہ کہ جدّی ورثہ
زاد وبوم او ر یہ وطن — قامتِ صبر پہ ہیں
اب تو تنگی کرتے — ذوقِ دل خواب وخیال
ایسے دق بیٹھے ہیں — سانس لے سکتے نہیں
اے مرے پیارے باپ — اے میری پیاری ماں
لو مجھے جانے دو اب — پر خفامت ہونا
بوسہ رخصت کا ضرور — بلکہ لوں گا مجبور
دل وجاں تم ہو مرے — پر کروں کیا کہ مجھے
اِک زبردست ہوس — میرے اپنے گھر سے
ہے چلی جاتی لیے — روز جنگل جنگل
اور اس سے باہر — تم تعفو نہ کرو
گر درختوں کے بھی جھنڈ — چھوڑ دیویں گے مجھے
بیکس وزاد وغریب — چاند سورج تو مجھے
اِک اُجالا دیں گے — گرہو چپّا بھی زمیں
دیکھ لو چاہو جہاں — کہ جو عالم کا ہے باپ
اس نے یہ گنبد سبز — کر دیا ہے سر پر
اپنے بندوں کے سپر — آہ اے پیارو
گر کبھی میں نہ پھروں — تو بھی خوش رہنا تم
اور سمجھنا دل میں — کہ خوش اقبالی نے

وہیں پہنچایا مجھے

اسمٰعیل میرٹھی کی نظم معریٰ ''تاروں بھری رات'' اور ''چڑیا کے بچے'' آزاد کے محولہ بالا ہیئتی تجربات کے بعد کی چیزیں ہیں۔ آزاد سے قبل جو ہیئتی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں، پروفیسر حنیف کیفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''بحیثیت مجموعی ہیئت کا بالکل نیا تجربہ اردو شاعری میں سب سے پہلے انہیں (آزاد) نے کیا۔ آزاد سے پہلے اردو شاعری میں ہیئت کے جو نام نہاد تجربے ملتے ہیں ان کی حیثیت مروجہ ہیئتیوں میں جزوی تبدیلیوں کی ہے۔ ان سے کسی نئی ہیئت کا تصور نہیں ابھرتا، انہیں دراصل ہیئت کے تجربے کہنا بھی صحیح نہیں۔ اردو شاعری میں ہیئت کے جتنے بھی تجربے کیے گئے ہیں وہ سب آزاد کے بعد کیے گئے ہیں مگر آزاد کے بے مثال انشا پردازی نے ان کی شاعری کو اور ان کی شاعری کی ''اصلاحیت'' نے ان کی ہیئت کے تجربوں کو ابھرنے کا موقع نہ دیا''۔ [1]

---

[1] (اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم، دہلی 1982ء صفحہ 265

درسی کتابیں

آزاد نے ابتدائی درجوں کے نصاب کے لئے کئی کتابیں تیار کیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے 1963ء میں ''اردو کی پہلی کتاب'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ جسے ترقی اردو بورڈ کراچی نے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب آزاد کی تیار کردہ پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پر مشتمل ہے۔ اسلم فرخی نے آزاد کی درسی کتابیں کے عنوان کے تحت آزاد کی پچیس درسی کتابوں کی فہرست دی ہے، جن میں عربی، فارسی، ترکی زبان کی کتابیں بھی شامل ہیں۔''[1]

آزاد لکھتے ہیں:

''بڑا حصہ عمرِ گراں بہا کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں، مگر مجھ سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا، بڈھا ہوکر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے ، چلتے، جاگتے، سوتے بچوں ہی کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں، بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔ خیر میرے پیارے وطن! تمہاری خدمت نہ کی، تمہارے بچوں کی خدمت کی۔''[2]

ان درسی کتابوں کی انشا دیکھ کر کوئی یہ گمان بھی نہیں کرسکتا کہ یہ اسی شخص کا کام ہے جس نے 'آبِ حیات' میں انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہاں مقصد کی سمت بدل

۱، ۲ بحوالہ ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' از سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ طبع دوم 1964 صفحہ 2,3

گئی ہے۔آزاد نے انتہائی غیر جذباتی ہوکر بچوں کی زبان میں متون تیار کئے ہیں۔ان کا مقصود محض زبان سکھانا نہیں تھا بلکہ روزمرہ اخلاق وآداب سے بھی بہرہ ور کرنا تھا۔ آزاد نے اخلاق آموز مضامین میں بچوں کی نفسیات کوملحوظ خاطر رکھا تا کہ بچوں کی دلچسپی بھی قائم رہے اوران کی جستجوؤں میں تکان کے آثار بھی پیدا نہ ہونے پائیں۔آزاد کی ان کتابوں سے قبل کسی نے اس قسم کے نصاب تیار کرنے کی ضرورت کومحسوس نہیں کیا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی مثال تھی جس کی وہ توسیع کرنے کا بیڑہ اٹھاتے۔مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی درسی کتابیں بہت بعد میں سامنے آئیں۔جوآزاد کے مقابلے میں زبان کے اعتبار سے مشکل بھی ہیں اور غیر دلچسپ بھی۔اس سلسلے میں اسلم فرخی کی یہ رائے بڑی وقعت رکھتی ہے:

> ''آقائے اردو،آزادصرف عظیم المرتبت انشا پرداز ہی نہیں، اہم تعلیمی مصنف بھی ہیں۔انہوں نے درسی کتابوں میں ادب اور افادیت کوجس خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے وہ ان کے بعد کسی اور سے ممکن نہ ہوا۔'' [1]

---

[1] بحوالہ ''آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ'' ازسید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ طبع دوم 1964 صفحہ 2

طرزِ نگارش

اسلوب پر گفتگو کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ محض انفرادی نہیں ہوتا یعنی محض کوئی ایک ادیب ہی صاحبِ اسلوب نہیں ہوتا۔ مصنف کے علاوہ ادبی دبستانوں کے بھی اپنے اپنے اسلوب ہوتے ہیں، ادب کی تاریخ میں تقریباً ہر عہد کا اپنا ایک حاوی اسلوب ہوتا ہے، جس سے اس کی زمانی تخصیصات قائم کی جاتی ہیں۔ بعض اصناف کے اسالیب اتنے واضح ہیں کہ ان کے مجموعی قدر کے تعین میں اسلوب کی دوشقوں کا حوالہ ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک وہ اسلوب جو اس صنف کے ساتھ مختص ہو گیا ہے (جیسے مرثیہ، قصیدہ اور غزل کا اپنا اپنا ایک حاوی اسلوب ضرور ہے۔ استثناء کی بات الگ ہے) دوسرے مصنف کا اپنا وہ طرز جو اسے منفرد بناتا ہے۔

☆

آزاد کا دور عبوری ان معنوں میں کہلاتا ہے کہ سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی سطح پر بہ یک وقت کئی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ ادبی تاریخ میں پہلی بار قدامت، روایت اور فرسودگی کے سوال اٹھے تھے۔ ادب اور حقیقت کے رشتے پر پہلی بار گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔ اصلیت کے ادھ کچرے تصور ہی میں حقیقت کا بھی ایک شائبہ تھا، لیکن بطور اصطلاح حقیقت کا لفظ قائم نہ ہو سکا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ تصوف میں ایک خاص تصور کے ساتھ اس کے معنی پہلے ہی سے معین تھے۔ آزاد نے اپنے لیکچرز اور دوسری تحریروں میں مجموعاً اردو شاعری کی کم مائیگی، دوسرے لفظوں میں پس ماندگی اور افلاس پر بالتاکید نشانے کسے ہیں۔ مضامین کی تکرار اور استعاراتی و آرائشی زبان پر بھی بآوازِ بلند گرفت کی ہے۔ ان کے اس رویے کو وقت یا حکومتِ وقت کے تقاضوں کے ایک جبر کا نام بھی دے

سکتے ہیں، جس نے انہیں بہت سی ایسی باتوں کے لیے اکسایا، جنہیں شاید وہ دل سے نہ چاہتے ہوں گے۔ کیوں کہ نئی نظم کا جو مشن لے کر وہ چلے تھے۔ اسے وہ جاری نہیں رکھ سکے اور اپنی ساری ادبی صلاحیت تنقیدی اور تحقیقی کاموں میں لگادی۔ تاریخ کے کام کو بھی اس ذیل میں رکھنا چاہیے۔ حالی نے شاعری سے اپنے رشتے آخر تک قائم رکھے اور ویسی ہی شاعری پر کاربند رہے جس کے لیے انہوں نے نظریہ قائم کیا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو آزاد کے لیے نثر ایک راہِ فرار تھی۔ ذوق کی صحبتوں کا تربیت یافتہ ذہن کب تک اپنے ضمیر کے خلاف دہائی دیتا رہتا۔ حالی کو تو غالب، سرسید اور شیفتہ کی صحبتیں میسر آئی تھیں، جن کا ادبی ذوق بڑا شستہ اور چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا طریقہ بھی معمول سے ہٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی مشرقیت میں کچھ ایسی گنجائشیں نکال لی تھیں جن میں لچیلا پن تھا۔ حالی بھی ٹھیٹھ مغربی نہیں بن سکے اور نہ ہی انہیں فنافی المغرب کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ ذرا سی روایت شکنی بھی ہمیں بہت بڑا چیلنج معلوم ہوتی ہے۔ آزاد میں اتنی بھی جرأت نہ تھی۔ زبان ان کی بہت بڑی طاقت تھی۔ زبان سے انہوں نے ہر طرح کا کام لیا۔ انہیں افسانہ سازی کے ساتھ ساتھ ڈرامہ سازی بھی آتی تھی۔ بیان کے ساتھ بیانیہ کا فن بھی آتا تھا۔ مشابہتوں کے عمل میں پیکر آفرینی کی وہ تخلیقی اہلیت بھی تھی، جس سے متن کی ساری فضا حرکت بینر بن جاتی ہے۔ ایک مضمون کو سورنگ میں باندھنا بھی انہیں خوب آتا تھا۔ ان کی نثر میں مراعات النظیر اور رعایت لفظی سے بھی بار بار سابقہ پڑتا ہے۔ غزل اور قصیدے کی تلفیظ سے انہوں نے لفظ اور لفظی خوشے بھی کسب کیے۔ مرکباتِ لفظی میں شعری وجدان کا عمل صاف نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ گویا شاعری میں اگر لفظوں کے تفاعل کی یہ نوعیت ہوتی تو وہ 'خود انکاری' کے مجرم ٹھہرائے جاتے اس لیے اپنی ساری تخلیقیت اور شعریت کو انہوں نے اپنی نثر کے کردار میں اس طور پر حل کر دیا کہ اسالیبِ نثر میں اس کی اپنی ایک وضع قائم ہوگئی۔ یہ طرزِ گفتار 'فسانۂ عجائب' کی مانند داستانی اسلوب سے بھی میل نہیں کھاتا۔ جس روانی، بلا تکلفی، بے ساختگی اور مسلسل آمد کی کیفیت کی یہ مظہر ہے اس میں قدیم رنگوں کی آمیزش کے باوجود اپنا ایک نیا پن ہے، اسی

نئے پن میں اس کی انفرادیت کا راز بھی مضمر ہے۔

آزاد کے نثری اسلوب میں اس قسم کی یکسانیت سے بھی سابقہ نہیں پڑتا جو ایک خاص منطقی تحفظ کے ساتھ ایک ہی ڈھرے پر اکتفا کر لیتی ہے۔ اس میں برابر پیچ بدلتا رہتا ہے۔ موقعہ کی تبدیلی جہاں واقع ہوئی وہیں جملوں کے لفظی نظام میں ایک غیر متوقع تبدیلی بھی در آتی ہے۔ انہیں نزاکتوں کے پیش نظر ان کے جملے مختصر ہونے کے باوجود پس رو اور پیش رو جملے سے زنجیر کی طرح مربوط ہوتے ہیں۔ زائد کم ہی ہوتا ہے۔ جہاں سورنگ سے ایک ہی مضمون کو باندھتے ہیں وہاں بھی یکساں قسم کے لفظوں کی تکرار سے گریز کی صورت اس خوبی سے نکال لیتے ہیں کہ 'سورنگ' کا احساس جاتا رہتا ہے۔

☆

تذکرۂ سنین، قصصِ ہند اور بیش تر مکتوبات میں لسان کا عمل سادگی آمیز اور راست نوعیت کا ہے۔ ایک تو یہاں موضوع کے تقاضے کچھ اور نوعیت کے تھے دوسرے یہ کہ تذکرۂ سنین کا شمار ان کے ابتدائی کاموں میں ہوتا ہے۔ قصص ہند، نصاب کی ضرورت کے تحت تیار کی گئی تھی۔ قصص ہند تو ترجمہ ہے۔ (مرزا حامد بیگ کی نئی تحقیق سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے) لیکن تذکرہ سنین کے بارے میں میں ڈاکٹر محمد صادق کا یہ شبہ برقرار ہے کہ وہ بھی ترجمہ ہے لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ترجمے کو طبع زاد کا قلب عطا کرنے میں آزاد کو غیر معمولی مہارت تھی۔ اس اعتبار سے صرف نیرنگِ خیال ہی کی مثال کافی ہے۔

☆

جن حضرات نے محولہ بالا کتابوں کے اسلوب کو ان کے آبِ حیات اور نیرنگ خیال کے اسلوب سے مختلف زمرے میں جگہ دی ہے۔ انہیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ 'آبِ حیات' میں وہ حاوی اسلوب جو رومانوی ہے اور آزاد کے اسلوب کی انفرادیت کا جس کے حوالے سے تعین کیا جاتا ہے۔ ہر مقام پر ایک ہی تاثر کا نقش قائم نہیں کرتا اور نہ ہی تخیل کا عمل یکساں سطح پر جاری رہتا ہے۔ پہلے قصصِ ہند کے اس اقتباس پر غور کریں۔

''الغرض جب کہ جہانگیر بادشاہ ہوا تو پھر اس کی نیت برگشتہ ہوئی

اور عشق کی چنگاری جو کجلا گئی تھی، وہ چمک اٹھی۔ علی قلی خاں کو بہانے سے بلا بھیجا اور چاہا کہ کسی ایسے ڈھب سے مروا ڈالے جس کا الزام نہ آئے۔ چنانچہ ایک دن اس کی شجاعت اور بہادری کی بہت سی تعریفیں کر کے مست ہاتھی کے سامنے کر دیا۔ اُس شیرِ جنگ نے اسے مار ہٹایا۔ پھر ایک شیر سے نہتا بھڑا دیا۔ اس نے بے ہتھیار ہی مارا اور شیر افگن خطاب لیا۔ جب یہ وار نہ چلے تو ایک راز دار کی زبانی صاف پیغام بھیجا۔ اس غیرت والے کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور سوچ سمجھ کر یہی مناسب دیکھا کہ اس نوکری پر لعنت کر کے اپنی جاگیر پر جا بیٹھے۔ بادشاہ نے قطب الدین خاں اپنے کوکہ کو وہاں کا صوبہ کر کے بھیجا اور اشارہ کر دیا کہ جس طرح پر ہو اس کا کام تمام کر دے۔

شیر افگن خاں بے خبر بردوان میں اپنی جاگیر پر بیٹھا تھا، سنتے ہی استقبال کو آیا، دو چار جاں نثار اس کے ساتھ تھے۔ قطب الدین خاں کے آدمیوں نے فوراً انہیں گرفتار کر لیا۔ شیر افگن خاں دیکھ کر حیران ہو گیا، سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا۔ تلوار گھسیٹ کر کہ جی کے ایسا ایک ہاتھ مارا کہ دو ٹکڑے ہو کر ہزار سالہ مردوں میں جا ملے۔'' (قصصِ ہند صفحہ 102)

یہاں پورا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جو شروع سے آخر تک بیحد مربوط بھی ہے اور کم سے کم لفظوں میں پوری سچویشن کو محیط بھی ہے۔ اب 'آب حیات' کا یہ ٹکڑا دیکھیں۔ سودا کے ساتھ مرزا فاخر کی گستاخی کی خبر سن کو آصف الدولہ کا ردعمل اور اس ردعمل پر سودا کا ردعمل۔ یہ ساری چیزیں کم سے کم لفظوں میں ڈھل گئی ہیں۔ دوسری بات کہ 'آب حیات' کا زمانہ اور نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار کا زمانہ ایک ہی ہے۔ ان دونوں کی پہچان فکشن سے وابستہ ہے لیکن دونوں کے ناولوں میں حتیٰ کہ ان کے بعد شرر اور رسوا کے ناولوں میں بھی مکالمات اکثر بیانیہ کی رو پر قدغن لگا دیتے ہیں۔ انہیں مکالمات کو بیان میں ڈھالنا کم آتا تھا۔ مکالمہ ڈرامے کی مجبوری ہے نہ کہ بیانیہ کی۔ آزاد کو اس فن پر پوری دستگاہی تھی۔ اسی

لیے واقعے کا سلسلہ کہیں درمیان میں نہیں ٹوٹتا۔ درج ذیل اقتباس میں ساری آپسی گفتگو کو آزاد نے پورے سیاق وسباق کے ساتھ بیان میں ڈھال دیا ہے۔

''آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کر بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو مرزا کو کیا۔ گویا ہم کو بے عزت کیا۔ باوا جان نے انہیں بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہ ہے۔ اسی وقت باہر نکل آئے۔ سارا حال سنا۔ بہت غصے ہوئے اور حکم دیا کہ شیخ زادوں کا محلّہ اکھاڑ پھینک دو اور شہر سے نکلوا دو۔ مرزا فاخر کو جس حال میں ہو اسی حال سے حاضر کرو۔ سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہئے۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب عالی ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصلہ ہو جاتی ہے۔ حضور اس میں مداخلت نہ فرماویں۔ غلام کی بدنامی ہے۔ جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی وہی کافی ہے۔ غرض مرزا رفیع بہ اعزاز واکرام وہاں سے رخصت ہوئے۔ نواب نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیئے''۔ (''آب حیات'' صفحہ 159)

☆

آزاد کو چہل قدمی اور ہوا خوری کی بھی عادت تھی۔ یہ عادت، اگرچہ معمولات میں فرق آ گیا تھا، دیوانگی اور وارفتگی کے عالم میں بھی برقرار تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے جو خطوط لکھے تھے۔ ان میں ربط کی کمی کے باوجود، ان کے محسوسات کا عکس دلپذیر اپنی جھلک دکھلا ہی جاتا ہے۔ بعض خطوط میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت کی روح کو انہوں نے کسب کر لیا ہو۔ جیسے فطرت ان سے اور وہ فطرت سے ہم کلام ہیں۔ یہ تاثر ان کی بعض نظموں میں داخلی واردات کے طور پر اس انداز سے نمو پاتا ہے جیسے سارے موسموں کی بو باس ان کے در و دیوار میں رچ بس گئی ہو۔

عبارت آرائی یہاں بھی انہیں دم نہیں لینے دیتی پھر بھی تہ بہ تہ جذبوں کی معصومیت بالراست قاری کے حواس پر اثر انداز ہو کر رہتی ہے۔ یہ کمالِ فن آزاد کے تخلیقی وفور اور تخلیقی

حس ہی کا زائدہ ہے:

''حقیقت میں لطف عجیب حاصل ہوتا جاتا ہے، سینہ ہلکا ہوتا تھا، گھبراہٹ تھم جاتی تھی۔ جوہڑ کے کنارے پر نیچے تو ہوا کی لہریں پانی سے مباحثے کر رہی تھیں۔ شیشم کا ہرا بھرا درخت اس کی شادابی کا لطف، ٹھنڈی ہوا کی موجیں، حکم ہوا (آزاد کا اشارہ کسی نامعلوم غیبی آواز کی طرف ہے) کہ یہاں رات کا سامان کر کے بیٹھو، دل بھوکا ہے، پیٹ بھوکا ہے۔ گھر آ کر تقاضائے شفقت سے صرف دہی چاٹ کر اور ڈیڑھ کباب سے منہ سلونا کر کے دسترخوان زیادہ کیا۔''

اس طرح کی ذاتی وارداتوں کو زبان دینے یا واقعات ولطائف کے بیان میں ان کی عبارتوں کا پیرایہ ہی بدل جاتا ہے۔ جہاں ثقافتی صورت حال کی تصویر کشی یا اپنے پسندیدہ شاعر کے تعارف کے دوران ان کا قلم اسمائے صفات کی تکرار اور انشا پردازی کے جوہر دکھائے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔ وہیں ان کا تخیل اپنی جولانیاں اور اپنی قدرت کا تماشہ دکھانے لگتا ہے۔ ذوق کے تعارف اور محولہ بالا حوالوں کے بیانات میں خاصا بعد ہے۔ ذوق کے تعارف والا آزاد قدیمی رنگ کا والہ وشیدا ہے اور واقعات کو قلم بند کرنے والے آزاد کی ترجیح صاف، شفاف اور حقیقت بیز زبان پر ہے۔ ذوق کے درج ذیل تعارف سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''جب وہ صاحبِ کمال عالم ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادرالکلام پھر

ہندوستان میں پیدا ہو۔''

تخیل جب جولانیاں دکھاتا ہے تو قلم زبان کا محکوم ہو جاتا ہے۔ مصنف کو پھر اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ اچھی خاصی جیتی جاگتی شخصیت، خیالی بن گئی ہے۔ مبالغہ اور غلو اس کے روپ کو بہروپ میں بدل دیتا ہے۔ کہیں حظ اور لطف ملتا ہے اور کہیں بدمزگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ آبِ حیات میں اس کیفیت سے کہیں کہیں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آزاد کی ساری تصنیفات کے مطالعے کے بعد اور خود آبِ حیات کو پڑھ کو میرا تاثر وہ نہیں رہا جس کی وجہ سے آزاد کو محض رومانی نثر نگار قرار دے دیا جاتا ہے۔ آزاد کا حاوی اسلوب تو ان کی اس افسانوی زبان سے تشکیل پاتا ہے جو سادہ اور شفاف ہے۔ تخیل کی آزادہ روی کے مواقع آتے ہیں مگر اس بھری پری کہکشاں میں اس کی حیثیت محض ایک لڑی کی ہے۔ ان کے حاوی اسلوب میں تمثیل کا بھی ایک رنگ ہے اور جو بہت گہرا ہے۔ لیکن تمثیل کا رنگ واقعیت کو مسخ نہیں کرتا بلکہ آزاد کو پڑھنے والا قاری واقعیت میں اس قدر کھو جاتا ہے اور آزاد بھی واقعے کا تانا بانا اس چابک دستی سے بنتے ہیں کہ تمثیل بیان کی فطری رو پر نہ تو کہیں غالب آتی ہے اور نہ قدغن لگاتی ہے۔ اس معنی میں آزاد اپنے زمانے کے ان نثر نگاروں کے صف ہی کے ادیب ہیں جو نثر کو زمانے سے ربط دینے کے لیے کوشاں تھے اور جن کی نثر جدید نثر کی بنیادیں وضع کرتی ہے۔[1]

---

[1] ''اردو زبان نے فارسی انشا پردازی سے جو فائدے اٹھائے، ان کا اعتراف کرتے ہوئے، ان نقصانات کی طرف 'آبِ حیات' ہی نے ہمیں سب سے پہلے توجہ دلائی، جو فارسی کی رنگین اور تخیلی انشا پردازی کی تقلید سے اردو کو پہنچے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نثر جو استعارے اور مبالغے کی کثرت سے بوجھل ہو رہی تھی، اس میں سادگی اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کرنا بہت کچھ 'آبِ حیات' کا کام ہے۔ اس کتاب نے ایک طرف فارسی کی پُرتکلف انشا پردازی کا بھانڈا کے سادہ، فطری اور پُرزور اندازِ بیان سے مقابلہ کر کے اردو نثر کی اصلاح کی ضرورت بجھائی اور دوسری طرف ان دونوں کو سمو کر انشا پردازی کا ایک نیا اور بے نظیر طرز پیش کر دیا۔ یہ اصولی اور عملی تعلیم بہت مفید ثابت ہوئی۔ لوگوں نے آبِ حیات کے بتائے ہوئے اصول کو پیشِ نظر رکھا اور آبِ حیات کے اسلوبِ بیان کو اپنے لیے نمونہ بنایا۔ اردو کے بہت سے نثاروں کے یہاں آبِ حیات کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، طبع دوم، لکھنؤ 1914ء، صفحہ 9-8

حرفِ آخر

انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ادبی منظر نامے کو جن ہستیوں نے متحرک اور پر جوش رکھنے میں وقیع تر کردار ادا کیا، ان میں سرسید، آزاد، حالی، رتن ناتھ سرشار، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی اور شرر کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ مختلف حضرات نے مختلف محاذ سنبھال رکھے تھے۔ ایک بڑا مقصد حال و ماضی کے احتساب سے تعلق رکھتا ہے، جس کی بنیاد پر مستقبل کی راہوں کے تعین کا کام نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ سرسید کی اصلاح کے مشن کی جہتیں کئی تھیں لیکن مقصد ایک ہی تھا کہ کس طرح قوم کی ذہنی اور اخلاقی پس ماندگی، نفسیائی پسپائی، مذہبی تنگ نظری، عمومی تغافل شعاری اور بے علمی جیسے عوارض کو دور کیا جائے۔ حالی کے سروکاروں میں اخلاق و ادب کی اصلاح کو ترجیح حاصل تھی، اساساً جس کا تعلق سرسید کے مشن ہی سے تھا۔ آزاد، سرسید کی تحریک کے حامی بھی تھے اور خیر خواہ بھی۔ لیکن ملازمت کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ وہ عملاً سرسید کے دوسرے رفقائے کار کی طرح مہم جویانہ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ڈاکٹر لائٹز اور پھر کرنل ہالرائیڈ کے منصوبوں کی بجا آوری اور کالج کی مصروفیات اپنی جگہ تھیں۔ خود ان کی ادھوری تصنیفات کی پیوندکاری کا کام کافی بڑا اور تھکا دینے والا تھا۔ سیاحت اور وہ بھی اس زمانے کی سیاحت جب سفر جسم و جان کی آزمائش کا نام تھا، علاوہ اس کے صحت کی خرابی مسلسل اور پھر جنون کا دور دورہ۔ گویا آزاد کے نجی مسائل کم نہ تھے۔ انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے شاعری کی اصلاح اور نظم کی ترقی کا علم وہ بلند ضرور کرتے ہیں۔ لیکن یہ منصوبے اور خاکے ڈاکٹر لائٹز کے بنائے ہوئے تھے۔ ملازمت کے باعث ان منصوبوں پر کام کرنے کی ذمہ داری ان پر لازمی تھی۔ پروفیسر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد وہ نظم کی ترقی والے مشن ہی سے دست بردار نہیں ہو گئے۔ شاعری

ہی تقریباً ترک کر دی۔ بہت سی کتابیں ادھوری پڑی ہوئی تھیں۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ میں لے لیتے اور پھر اسے ادھورا چھوڑ کر دوسرے میں لگ جاتے، شب و روز تلاش و جستجو اور کاٹ چھانٹ میں مصروف رہتے۔ ہر کتاب ان کا ایک خواب تھی، جس سے ان کا جذباتی لگاؤ تھا اور جو بہت شدید تھا۔ اسی شدتِ بے تحاشہ کے باعث وہ کبھی اسے سنبھالتے اور کبھی دوسرے کی طرف ٹوٹ پڑتے، کبھی یہ بے حد ضروری معلوم ہوتی اور کبھی وہ، گویا ارادے باندھنے اور توڑنے اور سنبھالنے اور سمیٹنے میں عمر عزیز کے بیش تر اوقات صرف ہوتے رہے۔ پھر بھی اپنی قلب گاہ کی گہرائیوں میں حوصلوں کی پرداخت سے کبھی غافل نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے ہاڈ اور مانس کا پیکر ہی تو ہے آدمی، اتنے مصائب اور منصوبوں کا انبار اور ایک مایۂ جانِ تواں۔

وہ تیشے مجھ پہ چلائے گئے کہ کٹ کٹ کر
میں اک پہاڑ تھا ذروں میں بٹ گیا آخر

بالآخر 60 برس کی عمر میں دیوانگی فرزانگی پر غالب آ گئی۔ ابھی نہاں خانہ لاشعور میں ایسے تجربات کے کئی خزینے دفن تھے، جن سے اردو ادب کی تاریخ کی ثروت مندی میں اور اضافے ممکن تھے۔ ایک چھوٹی سی زندگی میں 20 برسوں کا زیاں کوئی معمولی زیاں نہیں ہوتا آزاد جیسے نابغوں کے لیے زندگی بھر کی کمائی کا زیاں تھا۔ اور آزاد سے زیادہ اردو ادب اور اس کے امانت داروں اور جلا کاروں کا زیاں تھا جن کے لیے ادب ہمیشہ ایک سرچشمۂ مسرت و بصیرت، امکانات کا ایک سیل رواں، تہذیبِ عقل و جدان کا ساز اور روح و ضمیر کی آواز سے مماثل ہے۔

انتخاب نظم ونثر

میر محمد تقی میر

میر تخلص محمد تقی نام۔ خلف میر عبداللہ۔ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو۔ زبان فارسی کے معتبر مصنف اور مسلم الثبوت محقق ہندوستان میں تھے۔ گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ میر صاحب کا اُن سے دور کا رشتہ تھا اور تربیت کی نظر پائی تھی، عوام میں ان کے بھانجے مشہور ہیں۔ درحقیقت بیٹے میر عبداللہ کے تھے مگر اُن کی پہلی بی بی سے تھے۔ وہ مر گئیں تو خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔ اس لئے سوتیلے بھانجے ہوئے۔ میر صاحب کو ابتداء سے شعر کا شوق تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلّی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انہوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر خان صاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔ بدنظر زمانہ کا دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامنِ شہرت کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہے تو ایک داغ لگا دیتا ہے۔ چنانچہ تذکرۂ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت انہیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انہوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اس وقت انہوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ سودا کا ایک قطعہ بھی سن رسیدہ لوگوں سے سنا ہے مگر کلیات میں نہیں۔ شاید اس میں یہی اشارہ ہو۔

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

اخیر میں کہتے ہیں:

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد بیٹا تو گند نا بنے اور آپ کو تھ میر

پھر بھی اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی مسکینی وغربت اور صبر وقناعت، تقوے وطہارت محضر بنا کر ادائے شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے اور زمانہ کا کیا

ہے۔ کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

غرض ہر چند کہ تخلص ان کا۔ میر تھا مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہوکر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑایا ہندوستان میں یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ نحوست اور فلاکت قدیم سے اہل کمال کے سر پر سایہ کئے ہیں۔ ساتھ اس کے میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی۔ اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انہیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا اور وہ وضعداری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔ یہ الفاظ گستاخانہ جو زبان سے نکلے ہیں۔ راقم روسیاہ ان کی روحِ پاک سے عفوِ قصور چاہتا ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا فقط اس لئے ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں گزارہ کرنا ہے۔ وہ دیکھیں کہ ایک صاحبِ جوہر کا جوہر یہ باتیں کیونکر خاک میں ملا دیتی ہیں۔ چنانچہ انہیں کے حالات ومقالات عنقریب اس بیان کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ دلّی میں شاہ عالم کا دربار اور امراؤ شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور ان کے جوہر کمال اور نیکی اطوار وعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے۔ مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔ اور وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لئے ۱۱۹۰ھ میں دلّی چھوڑنی پڑی۔

جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہوگئے اور دلّی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چین بہ جبین ہوکر بولے کہ۔ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھیے مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا

ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے۔ ایک سرا میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ۔ ایک پورا تھان پستو لئے کا کمر سے بندھا۔ ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں۔ مشروع کا پاجامہ۔ جس کے عرض کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی۔ جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار۔ دوسری طرف کٹار۔ ہاتھ میں جریب غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ۔ نئے انداز۔ نئی تراشیں۔ بانکے ٹیڑھے جوان جمع۔ انہیں دیکھکر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن۔ زمانہ کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے۔ اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی۔ اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپے مہینہ کر دیا۔

عظمت و اعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں اگرچہ انہوں نے لکھنؤ میں بھی میر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر انہوں نے بھی بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصاحب تھے اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ چنانچہ کبھی کبھی نواب کی ملازمت میں جاتے تھے۔

ایک دن نواب مرحوم نے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی!

مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کردے اُس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجئے گا۔

ایک دن نواب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمایئے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چین بہ جبین ہوتے تھے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب کہے جاتے کہ کہ ہاں پڑھئے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرلے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی کہ ع واویلا مرد شبہ شاعراں۔

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان غزلوں کے ہیں۔ چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ متفرق شعروں پر اردو مصرعہ لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے۔ اور یہ ایجاد ان کا ہے۔ رباعیاں، مستزاد، چند صفحے۔ چار قصیدے منقبت میں اور ایک نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔ چند مخمس اور ترجیع بند مناقب میں۔ چند مخمس شکایت زمانہ میں جن سے بعض اشخاص کی ہجو مطلوب ہے۔ دو واسوخت۔ ایک ہفت بند ملا حسن کاشی کی طرز پر حضرت شاہ ولایت کی شان میں ہے۔ بہت سی مثنویاں جن کی تفصیل عنقریب واضح ہوتی ہے۔ تذکرۂ نکات الشعرا۔ شاعران اردو کے حال کا کہ اب بہت کم یاب ہے۔ ایک رسالہ مسمّٰی بہ فیض

میر۔ مصحفی اپنے تذکرہ فارسی میں لکھتے ہیں۔ دعوی شعر فارسی ندارد مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست میگفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم دراں حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم۔

معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق نہ تھا۔ علی ہذا القیاس مرثیہ بھی دیوان میں نہیں غزلوں کے دیوان۔ اگر چہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر جوان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں۔ اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں۔ ستر اور دوستر نشتر ہیں۔ باقی میر صاحب کا تبرک ہے۔ لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے۔ کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے۔ تو ہر سخن شناس سے مبالغہ تعریف میں یہی سنا جاتا ہے کہ دیکھئے! یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔ انہوں نے زبان اور خیالات میں جن قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے۔ اتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل اصول غزلیت کے لحاظ میں سوواسے بہتر ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے۔ اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے۔ حقیقت میں یہ انداز میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انہوں نے اس میں مضمون داخل کیا۔ اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔

چونکہ مطالب کی دقت۔ مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان وشکوہ۔ بندش کی چستی۔ لازمہ قصائد کا ہے۔ وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش وخروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجہ میں بھی کم ہیں۔ انہوں نے طالب علم پر روشن کر دیا ہے کہ قصیدہ اور غزل کے دو میدانوں میں دن اور رات کا فرق ہے اور اسی منزل میں آ کر سودا اور میر کے کلام کا حال کھلتا ہے۔

امرا کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت۔ انہیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا خود پسندی اور خود بینی جو انہیں اپنے میں آپ غرق کئے دیتی تھی۔ وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصفِ گل دیا سمن نہیں میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں
کل جا کے ہم نے میر کے در پر سنا جواب مدت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں

چند مخمس شکایتِ زمانہ میں بطور شہر آشوب کے کہے ہیں اور ان میں بعض اشخاص کے نام بھی لئے ہیں۔ مگر ایسے کمزور کہے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ قسام ازل نے ان کے دسترخوان سے مدح اور قدح کے دو پیالے اٹھا کر سودا کے ہاں دھر دیئے ہیں۔

واسوخت۔ دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں۔ اہل تحقیق نے فغانی یا وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انہیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے۔ سیکڑوں شاعروں نے واسوخت کہے لیکن خاص خاص محاوروں سے قطع نظر کریں تو آج تک اس کوچہ میں میر صاحب کے خیالات و انداز بیان کا جواب نہیں۔

مناقب میں جو مخمس اور ترجیع بند وغیرہ کہے ہیں حقیقت میں حسن اعتقاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ ان کے صدق دل کی گواہی دیتے ہیں۔

مثنویاں مختلف بحروں میں ہیں۔ جو اصول مثنوی کے ہیں وہ میر صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا ہے اس لئے بعض بعض لطف سے خالی نہیں۔ ان میں شعلۂ عشق اور دریائے عشق نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانہ سے پایا۔ مگر افسوس یہ کہ میر حسن مرحوم کی مثنوی سے دونوں پیچھے رہیں۔

جوش عشق میں لطافت اور نزاکت کا جوش ہے مگر مشہور نہ ہوئی اعجاز عشق و خواب و خیال مختصر ہیں اور اس رتبہ پر نہیں پہنچیں۔ معاملات عشق ان سے بڑی ہے مگر رتبہ میں گھٹی ہوئی ہے۔

مثنوی شکار نامہ میں نواب آصف الدولہ کے شکار کا اور اس سفر کا مفصل حال لکھا ہے۔ اگرچہ زبان اچھی نہیں مگر کیفیت اور لطف محاورہ سے خالی نہیں۔ اس میں جو متفرق غزلیں جا بجا لگائی ہیں وہ عجب لطف دیتی ہیں۔

ساقی نامہ بہاریہ لکھا ہے اگرچہ مختصر ہے مگر اعلیٰ درجۂ لطافت و فصاحت پر ہے اس کے علاوہ بہت سی مختصر مختصر مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی اپنے مرثیہ میں لکھی ہے۔

فرماتے ہیں کہ میرا پیارا مرغہ تھا۔ بڑا اصیل تھا۔ بہت خوب تھا۔ اس پر بلی نے حملہ کیا۔ مرغہ نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا اور اخیر کو مارا گیا۔ مثنوی تو جیسی ہے ویسی ہے مگر ایک شعر اس کے وقت اخیر کا نہیں بھولتا۔

جھکا بسوئے قدم سرخروس بیجاں کا زمیں پہ تاج گرا ہد ہد سلیماں کا

ایک مثنوی میں کہتے ہیں کہ میری ایک بلی تھی۔ بڑی وفادار تھی۔ بڑی قانع تھی۔ اس کے بچے نہ جیتے تھے۔ ایک دفعہ پانچ بچے ہوئے۔ پانچوں جیئے۔ ۳ بچے لوگ لے گئے۔ دو رہے وہ دونوں مادہ تھے۔ ایک کا نام موئی رکھا۔ ایک کا نام مائی۔ موئی ایک میرے دوست کو پسند آئی وہ لے گئے۔ مائی کے مزاج میں مسکینی اور غربت تھی اس لئے فقر کی رفاقت نہ چھوڑی۔ اس کے بیان حالات کو بہت طول دیا ہے۔

ایک کتا اور ایک بلا پالا تھا اس کی ایک مثنوی لکھی ہے۔

ایک امیر کے ساتھ سفر میں میرٹھ تک گئے تھے۔ اس میں برسات کی تکلیف اور رستہ کی مصیبت بہت بیان کی ہے۔ اس سے یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہم وطن ہمیشہ سے سفر کو کیسی آفت سمجھتے ہیں۔

ایک بکری پالی۔ اس کے چار تھن تھے۔ بچہ ہوا تو دودھ ایک ہی تھن میں اترا۔ وہ بھی اتنا تھا کہ بچہ کو پوری نہ پڑتی تھی۔ بازار کا دودھ پلا پلا کر پالا۔ پھر بچہ کی سرزوری اور سرشوری کی شکایت ہے۔

ایک مثنوی آصف الدولہ مرحوم کی آرائش کتخدائی میں کہی ہے۔ ایک مختصر مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کر کے لکھی ہے اور اس کی بحر مثنوی کے معمولی بحروں سے علیحدہ ہے۔

مثنوی اژدرنامہ کہ اس کا حال آگے آتا ہے۔ یا اجگر نامہ۔

ایک مثنوی مختصر برسات کی شکایت میں لکھی ہے۔ گھر کا گرنا اور مینہ برستے میں گھر والوں کا نکلنا عجب طور سے بیان کیا ہے۔ اگر خیال کرو تو شاعر کی شورش طبع کے لئے یہ موقع خوب تھا۔ مگر طبیعت مکان سے بھی پہلے گری ہوئی تھی وہ یہاں بھی نہیں ابھری۔ سودا

ہوتے تو طوفان اٹھاتے۔

مثنوی تنبیہ الخیال۔ اس میں فن شعر کی عزت وتوقیر کو بہت سا طول دے کر کہا ہے کہ پہلے اس فن شریف کو شرفا اختیار کرتے تھے۔ اب پواج دارازل بھی شاعر ہو گئے۔ اس میں ایک بزاز کے لونڈے کو بہت خراب کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں کہ چنداں ذکر کے قابل نہیں۔

نکات الشعرا۔ شائق شعر کے لئے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ[1] ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں۔ ''وے شاعر یست از شیطان مشہور تر'' میر خان کمترین[2]۔ اسی زمانہ میں ایک قدیمی شاعر ولی کے تھے انہیں اس فقرہ پر بڑا غصہ آیا ایک نظم میں اول بہت کچھ کہا۔ آخر میں آ کر کہتے ہیں۔ ع ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں —— یہ تھی مختصر کیفیت میر صاحب کی تصنیفات کی۔ میر صاحب کی زبان شستہ۔ کلام صاف۔ بیان ایسا پاکیزہ۔ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورہ کا رنگ

---

[1] یہ بھی میر صاحب کا دعویٰ ہے۔ ورنہ اس سے پہلے بھی تذکرے مرتب ہو چکے ہیں۔

[2] کمترین تخلص۔ میر خاں نام تھا۔ تخلص میں یہ نکتہ رکھا تھا کہ قوم کے افغان تھے۔ ترین فرقہ کا نام تھا۔ کمترین تخلص کیا تھا۔ بہت سن رسیدہ تھے۔ شاہ آبرو اور ناجی کے دیکھنے والوں میں تھے۔ مگر چوتھے طبقہ کے شاعروں میں موجود ہوتے تھے۔ پرانے سپاہی تھے۔ کچھ بہت علم بھی نہ تھا۔ طبقہ اول کے رنگ میں ایہام کے شعر کہتی تھی۔ اور فصیل بھی تھے۔ اور وقت پر جو سوجھ جاتی تھی اس میں چوکتے نہ تھے۔ صاف کہہ بیٹھتے تھے۔ کوئی ان کی زبان سے بچا نہیں مگر وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ علما، شرفا سب سنتے تھے۔ اور ہنس ہنس کر برداشت کرتے تھے۔ وضع بھی دنیا سے نرالی رکھی تھی۔ ایک بڑی سی گھیر دار پگڑی سر پر باندھتے تھے۔ لمبا سا دوپٹہ بل دیکر کمر پر لپیٹتے تھے۔ ایک بلم ہاتھ میں رکھتے تھے۔ اپنے اشعار کہ میر جعفر مرحوم کی زٹل کی کھرچن ہوتے تھے۔ خود پرچوں پر لکھ کر کمر میں رکھتے تھے۔ اُن دنوں ہر جمعہ کو سعد اللہ خاں کے چوک پر گزری لگتی تھی۔ وہاں جا کھڑے ہوتے تھے۔ لڑکے اور شوقین خوش مزاج خاطر خواہ دام دیتے تھے۔ اور ایک ایک پرچہ خوشی خوشی لے جاتے تھے۔

دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ گویا اردو کے سعدی ہیں۔ ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیاں اور خیالات کی بلند پروازیاں ان کے مبالغوں کے جوش وخروش۔ سب کو معلوم ہیں مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان میں سے بھی میر صاحب کو شگفتگی۔ یا بہار عیش ونشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اس کا دکھڑا سناتے چلے گئے۔ جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے لئے خیالی تھے۔ ان کے حالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی۔ زار نالی۔ حسرت مایوسی۔ ہجر کے لباس میں خرچ ہوئے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم وورد کا پتلا نہیں۔ حسرت واندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گزرتے تھے۔ وہی زبان سے کہہ دیتے تھے کہ سننے والوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔

(آبِ حیات)

مرقع خوش بیانی

خوش بیانی کا مرقع اور فصاحت اصلی و نقلی کی جنگ

جس شغل میں مدت تک انسان کی دل لگی رہی ہو، اُس سے بالکل دل کا اٹھالینا بہت دشوار ہے۔ ہر چند دل کو اس کی یاد سے حرکت نہ دیں، مگر اس میں آپ ہی آپ خیالات پیدا ہوتے ہیں، جیسے سمندر میں مدوجزر آ کر ٹھہر جاتا ہے اور ہوا کے جھونکے بھی تھم جاتے ہیں، مگر پانی گھڑیوں پڑا لہرایا کرتا ہے۔ اسی طرح آج مجھے خیال ہوا، یعنی پچھلی رات باقی تھی جو بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی۔

اس عالمِ خواب میں خوش بیانی کا ایک مرقع مسلسل مری آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوش بیانی اصلی تھی یا نقلی ، یا دونوں سے مرکب تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوا گویا مجھے ایسی سرزمین میں لے گیا ہے، جو دنیا کے عجائب وغرائب سے مالا مال، بلکہ سحر کاری اور نیرنگ سازی سے بھری ہوئی ہے۔ اس ملک میں ایک ملکہ کی حکمرانی تھی، جسے وہاں کے لوگ ملکۂ سخن آرا سمجھتے تھے۔ مگر دنیا کے لوگ خوش بیانی بے معنی مشہور کرتے تھے۔ دیکھتا ہوں کہ باغ سے شہر اور شہر سے اجاڑ تک، بلکہ کھیت سے جنگل اور جنگل سے پہاڑ تک، کوئی شے ایسی نظر نہیں آتی ، جو ذرا اصلیت کا رنگ رکھتی ہو۔ بعضے درختوں پر سونے روپے کے پتے لہلہاتے تھے۔ بعض پر تاش تمامی کے پھول جگمگاتے تھے۔ ٹہنیوں میں گوہر لٹکتا اور جوہر بے بہا آویزاں تھے۔ فواروں میں کیوڑا اور بید مشک پڑا اچھلتا تھا اور اس کی دھاروں میں سُریلی آوازیں لہراتی تھیں۔ جنگل کی گود کے پالے، ہرنیاں اور پاڑھے صحرا کے دامن میں لوٹ رہے تھے۔ دریا کے پیارے ننھے آبی جانور

اور نگین رنگین مچھلیوں کے لچھے نہروں میں جھلملا رہے تھے۔ پرندے بھی بے شمار تھے، مگر اکثروں کی چونچیں سنہری تھیں، اکثروں کے بازو ہیرے اور یاقوت سے تراشے تھے۔ اس پر نغمہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ اُن کے سامنے شعرا کی غزل خوانی کا دم بند ہوتا تھا۔ پھولوں نے ہوا کو عنبر و لوبان، مشک و زعفران سے بسا رکھا تھا۔ عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں۔ اور یہ ملی جلی خوشبوئیاں الگ الگ ایسی کیفیتیں دیتی تھیں گویا روشِ ہوا پر گل کاری کے تختے کھلے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے صبا و نسیم کے دامن عاشقانِ مہجور کی آہوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو موج ہوا تھی، حسرت زدوں کے پیاموں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

میں اس دشتِ سحر نگار میں ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر اُن عجائبات کو دیکھ کر مجھ سے بولے بغیر نہ رہا گیا، اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا۔ مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو میری آواز گونج کر پلٹتی تھی، وہی میری باتوں کا جواب ہوتی تھی۔ باوجود اس کے کبھی اتفاق کرتی تھی، کبھی تردید کرتی۔ غرض اَن دیکھے ہمراہیوں کے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا تھا، جو ایک غار کے سرے پر پہنچا۔ دیکھوں، تو اندھیرا گھپ ہے۔ آگے بڑھا تو ذرا آنکھیں روشن ہوئیں اور معلوم ہوا کہ ایک عمارت عالی شان بنی ہوئی ہے۔ اس کے دروازہ پر جو اشعار سونے کے حرفوں سے لکھے ہوئے تھے، اُن سے معلوم ہوا کہ یہ خیال پرستوں کا مندر ہے، اور ایک دیو مہاراج اس کے دروازے پر بیٹھے ہیں کہ عالمِ حماقت کے فرمانروا ہیں۔ سر پر دستار سرگردانی ہے اور تاج کی جگہ ایک سرو سر پر باندھ لیا ہے۔ قلندرانہ لباس پہنے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کتاب لئے ہیں، دوسرے میں جھنجھنا ہلاتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف محنت بیٹھی عرق ریزی کر رہی ہے اور آگے چراغ چل رہا ہے۔ بائیں ہاتھ پر تلون مزاجی کھڑی ہر دم نیا رنگ بدل رہی ہے، کندھے پر ایک عجیب الحرکات یعنی بندر بیٹھا اچھل رہا ہے۔ وہ کبھی جھک جھک کر سلام کرتا ہے، کبھی منہ چڑانے لگتا ہے، کبھی ٹہنیاں ہلانے لگتا ہے۔ اس کے پیش قدم بھینٹ چڑھانے کی جگہ عجیب ڈھنگ کی بنائی تھی اور پیچھے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت وہ ایسی ہی تھی، جیسا کہ اس کے گرد لکھا ہوا تھا۔ بہت سی بھینٹ اور قربانیاں وہاں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر

صورت بائے بے معنی کے جانور وہاں لٹکتے تھے، جن کا نام ان کے معتقدوں نے نازک خیالی اور رنگین بیانی رکھا تھا۔ یہ جانور حروفِ بے آواز اور آواز بے حروف کے زمرے بھرتے تھے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ سراسر مضمون، مدعا غائب۔ بہت سی مشابہ صورت کی طوطیاں اور غلط نما بلبلیں تھیں کہ کبھی نظر آتی تھیں، کبھی غائب ہو جاتی تھیں۔ اکثر نیم بسمل پڑے تڑپتے تھے۔ معلوم ہوا کہ تشبیہوں اور استعاروں کا گنج شہیداں یہی ہے۔ وہیں ایک مجلس نظر آئی جس کے اہل محفل میں کسی کی ایک آنکھ کسی کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں اور جو بھینگے نہ تھے، وہ طاتی تھے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے تجنیس اور ایہام وغیرہ صنعتوں پر اپنی آنکھیں قربان کر دی ہیں۔ ایک طرف زمین شعر میں درخت بنا کر کھڑے کر دیئے تھے، مگر ثمر اصلا نہیں تھا اور ثمر تھا، تو مزہ ذرا نہ تھا۔ یہ مندر اُن کے پجاریوں اور مہنتوں سے بھرا ہوا تھا، جن کی آنکھیں تو بند تھیں مگر وہم و وسواس انگلی پکڑے انہیں لئے پھرتے تھے۔ اور جن شغلوں میں لگا دیتے تھے، انہی میں لگ جاتے تھے۔ ایک طرف ایک پلٹن تھی، فقط ہیرے پھیرے کرتی پھرتی تھی، اس کا نام قواعد رکھا تھا۔ کبھی ننگے سر ہو جاتے تھے، کبھی ایک ننگے سر اور ایک ننگے پاؤں[1] ہو کر گنڈے دار ہو جاتے تھے۔ کبھی اکہرے ہو جاتے تھے، کبھی دوہرے ہو جاتے تھے، کبھی سب باہم گلے میں ہاتھ ڈال کر لوٹ جاتے تھے۔ اضطراب اور گھبراہٹ نے ایک غلط ملط کتاب بنا کر اُن کے ہاتھ میں دے دی تھی؟ اسی کے بموجب اُن کی قواعد تھی۔ آگے دیکھتا ہوں کہ ایک مجمع ایسا کھڑا ہے گویا دربار کو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک ننگا آدمی آیا اور برابر سب کی پگڑیاں اتارتا چلا گیا کہ اپنے لئے کپڑے بنائے۔ معلوم یہ ہوا کہ کوئی شاعر ہے کہ توشیح کا عمل کر کے کسی بادشاہ کا نام نکال رہا ہے۔ اُن سے آگے اور بھی اعلیٰ درجہ کے لوگ نظر آئے۔ دیکھتا ہوں کہ بہت سی کرسیاں بچھی ہیں۔ ان پر کچھ اشخاص کھڑے ہیں، کسی کے ہاتھ میں ایک ریت گھڑی ہے کہ وقت کا اندازہ بتائے۔ کسی نے ایک دائرہ کھینچ کر ہاتھ

---

[1] یعنی بے نقط یا منقوط، یا فقط اوپر ہی نقطے ہوں، یا نیچے ہی نقطے ہوں، یا حروف اس کے ایک ایک الگ الگ تحریر ہوں، یا سب کے سب ملا کر لکھے جا سکتے ہوں۔

میں لے لیا ہے اور منہ سے نفیری بجا رہا ہے۔ مگر بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ ایک امیر کا بیاہ ہوا ہے اور ایک کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ اُن کی تاریخیں کہہ رہے ہیں اور ایک طرف دیکھتا ہوں کہ دو رُخے انسان بیٹھے ہیں، مگر منہ سے کچھ نہیں بولتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایسے فقرے اور شعر ہیں جو اُلٹے سیدھے دونوں طرف سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر لطف معنی ندارد۔

مندر کی مغربی جانب میں دیکھا کہ چند اشخاص نہایت محنت کے کام میں مصروف ہیں اور بہت سے ڈھیر ان کے آگے پیچھے پڑے ہیں۔ اُن سے میں نے پوچھا کہ صاحب کیا کر رہے ہو؟ بولے کہ معموں کا ذخیرہ تیار کر رہے ہیں کیونکہ دیوتا کو اس سے زیادہ کوئی بھینٹ نہیں بھاتی۔ ان ڈھیروں میں ایسی طرح بہ طرح کی چیزیں تھیں کہ ایک کو دوسری سے نسبت نہ تھی۔ بہت سی گڈیاں بھی بندھی تھیں اور لکڑی کے انبار کی طرح اوپر تلے پڑی تھیں۔ انہی میں ایک جگہ لنگر لنگوٹے، ایک طرف جُبّے اور عمامے، پھر انہیں میں پشواز اور پاؤں کے گھنگرو چھوٹی بڑی تھیلیوں اور پوٹلیوں میں بندھے آٹم لگے ہوئے تھے۔ ایک گٹھڑی میں سے ایک کاٹ کے گھوڑے کا سر بھی نکلا ہوا تھا۔ میں وہاں سے گھبرا کر چلا۔ اتنے میں ایک کاری گر نے مجھے متحیر دیکھ کر پکارا کہ جناب ایک ایک پوٹلی میں گنج کے گنج نازک خیالیاں ہیں۔ اگر آپ کہیں تو دکھاؤں۔ میں نے سلام کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معاف کیجئے، اس وقت مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔

میں مندر سے باہر جاتا تھا، جو دیکھا کہ بہت سے آدمی آگے پیچھے بے ترتیب ایک جگہ جمع ہیں۔ مگر آمنے سامنے بیٹھے پٹاپٹ قافیہ بازی کر رہے ہیں۔ اپنی تک بندی پر آپ ہی آپ خوش ہوتے ہیں اور تفاخر کی ٹوپیاں اچھالتے ہیں۔ ابھی ان کے پاس ہی تھا، جو دیکھا کہ آگے دوہری دوہری، تہری تہری تک بندیاں ہو رہی ہیں۔ انہیں سُن کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ اُن کے پاس ہی دیکھا کہ بہت سی خندہ جبیں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، مگر جسے دیکھتے ہیں، اسے کوئی اور شخص سمجھ کر ہنسنے لگتے ہیں، اور ایسی مسخراپن کی غلطیاں کرنے کے لئے جوڑی جوڑی ہو گئے ہیں۔ ہر جوڑی سر سے پاؤں تک ایک ہی لباس پہنے ہے، مگر اصل

میں ایک کو دوسرے سے مناسبت بھی نہیں۔ کبھی کسی بوڑھے پر اتم کولڑکا فرض کر لیتے ہیں۔ کبھی مرد کو عورت سمجھ لیتے ہیں۔ کبھی حبشی کی جگہ فرنگی بٹھا لیتے ہیں اور اس پر آپ ہی آپ خوش ہو کر واہ وا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ معموں کا جمگھٹ ہے۔

جب ان طلسمات کو دیکھتے دیکھتے میرا سر پھر گیا، تو گھبرا کر وہاں سے نکلا۔ باہر دو چار کھیت آگے بڑھا تھا، جو دفعتہً ایک ہیبت ناک محل اور ساتھ ہی طبلِ جنگ کی آواز آئی اور ایسا معلوم ہوا، گویا کوئی فوج جنگی چڑھی چلی آتی ہے۔ آخر جو میں نے قیاس کیا تھا، وہی نکلا یعنی دور سے ایک روشنی کا غبار نمودار ہوا۔ اس کے درمیان ایک مرد باوقار، صاحب شکوہ، سر پر اعزاز کا تاج رکھے، گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے۔ جو اُسے دیکھتا تھا کہتا تھا کہ سچ ہے اور برحق ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اس کا فرزندِ دلبند خراماں خراماں آتا تھا۔ پشت پر بہت سے ترکش لٹکتے تھے۔ ہاتھ میں چڑھی کمان اور کمان میں تیر جوڑا ہوا تھا۔ اس کا نام حسنِ بیان تھا۔ جوں ہی ان دونوں کے آنے کی خبر اُڑی، ظرافت بے معنیٰ کے تمام ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ عالمِ حماقت کے دیوتا یعنی اوت مہا بھوت بذاتِ خود اپنی ایک کالی گھٹا کے رنگ میں فوج لے کر اٹھے۔ بادل کی طرح گرجتے، اور مینہ کی طرح برستے، سر پر آ موجود ہوئے۔ اور جن جن نامعقولوں کو میں نے مندر میں دیکھا تھا، وہ انبوہِ بے تمیزی اندھیری رات کی طرح ایک لشکر کی صورت میں نمودار ہوئے اور جھٹ صفیں باندھ لیں کہ دشمن کا آگا روکیں۔ جو جو معتقد جان نثار تھے، انہیں حکم پہنچا کہ گھوڑے اُڑا اُڑا کر سامنے اُچھلو اور لغات کی لفاظی اور مبالغوں کی دھوم دھام سے غل مچاؤ کہ حریف سنتے ہی ڈر کر بھاگ جائے۔ چونکہ حریف بہت آہستہ آہستہ کوچ کر رہا تھا، اس لئے یہاں کے سرحدی لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ بھیڑ اکٹھی کر کے الگ کھڑے ہو جائیں اور اُس وقت کے منتظر رہیں کہ اخیر کو میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

شائقینِ سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خوش بیانی مرکب کے فرقہ ہائے مختلفہ سے آباد تھا یعنی کچھ اصل، کچھ بداصل۔ چنانچہ ان کی فوج کی عجیب شان تھی۔ مردوں کے جسموں میں برچھیاں چبھی ہوئی تھیں۔ عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی

شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر مردوں کے دل انگارے تھے، تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھیں۔ غرض کہ جیسے عجائب وغرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا، اُس حالت کی رنگا رنگی بیان کے احاطہ میں محصور نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جس وقت حریف کا نشان نمودار ہوا، دفعتہ ان میں ایک ہل چل مچی، اور فوراً دو حصہ ہوکر ایک حصہ سچ کے سایۂ علم میں جا کھڑا ہوا، دوسرا ادت مہا بھوت یعنی جھوٹے دیوتا کے نشان کے نیچے ہوگیا۔ دیو دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لئے چند قدم آگے بڑھا۔ مگر جوں ہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی، وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اصلی جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا۔ آخر ادھر سے سچ بھی آگے بڑھا۔ جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیو روسیاہ نیست و نابود ہوگیا اور جہاں کالا پہاڑ تھا، وہاں خاک سی اُڑ کر رہ گئی۔ تم نے آفتاب کو دیکھا ہوگا کہ جوں جوں نکلتا آتا ہے، چھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا نقشِ وجود سامنے کے نصف کرہ سے بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیو دروغ یعنی ادت مہا بھوت تو بالکل نیست و نابود ہو گئے اور نہ فقط دیو دروغ بلکہ سارا لشکر شیطان جو ہمدردی اور جان نثاری کو حاضر تھا، دم کے دم میں ہوا ہوگیا۔ طلسم باطل کا مندر زمین میں غرق ہوگیا۔ مچھلیاں دریاؤں میں چلی گئیں۔ پرندے چڑیوں کی طرح اڑ گئے۔ جنگلی حیوان جنگل میں چلے گئے اور اب زمانہ نے نئے سرے سے اصلی رنگ بدلا یعنی چشموں کی روانی، مرغانِ خوش الحان کے چہچہے، پھولوں کی خوشبویاں، روئے زمین کی سرسبزی نے سچا رنگ نکالا۔ اگرچہ میں ابھی پڑا سوتا تھا، مگر اس عالم میں ایسا معلوم ہوا کہ اب خوابِ غفلت سے میری آنکھ کھل گئی اور ان طلسمی عجائب وغرائب کی جگہ پر سرسبز جنگل، اصلی نہریں، ہری بھری کیاریاں ہوگئی ہیں۔

جن شعبدوں کے اچنبھے نے میری عقل وحواس کو درہم برہم کر دیا تھا، جب وہ سامنے سے دور ہوا تو میں نے خوش بیانی اور صداقت کے جلوہ کو نظرِ غور سے مشاہدہ کیا، کیونکہ انسان ایک چیز سے نظر اٹھائے بغیر دوسری چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ ان کے بعد مجھے ایک انبوہ نظر آیا، جن میں شاہنامہ کی بحرِ متقارب فردوس کے پھولوں کا تاج

سر پر رکھے شمشیر برہنہ علم کئے کھڑی تھی۔ خاقانی قصائد کے تاتار میں خاقانِ چین بنا ہوا تھا۔ پہلو میں انوری اور بدر چاچی مضامین سے نور اڑا رہے تھے۔ خاص خاص قسم کی مثنویاں، غزلیں اور رباعیاں اپنے اپنے درجہ سے اس کے دائیں بائیں اور پیش و پس آراستہ تھیں۔ نثر اپنے پیادوں کی صفیں باندھ رہی تھی۔ مرثیوں کی نظم ونثر غم ناک سنبل سے بال بکھیرے، جامۂ خون آلود پہنے، خاموش کھڑی تھی۔ ہجو کے ہونٹوں پر تبسم تھا، مگر خنجر زیر قبا لئے کھڑی تھی کہ جدھر موقع پاؤں گی، ہرگز نہ چوکوں گی۔ فصاحت کا علم نصرت بلند تھا اور اس سے پہچانا جاتا تھا کہ بجائے پھریرے کے اس پر بجلی کوند رہی تھی۔ اس سارے مرقع کے پیچھے لطائف وظرائف بھی نسیم وصبا کی طرح خراماں خراماں پھر رہے تھے، اور درحقیقت مہم کے شروع ہونے سے پہلے انہیں یہاں جمایا تھا کہ ایسا نہ ہو، دشمن سے جا ملیں کیونکہ وہ دلوں سے ایک نگاہ ادھر بھی رکھتے تھے۔ انہیں کے پہلو میں مشاعرہ کا جلسہ تھا اور حافظؔ اور سعدیؔ کی غزلوں سے شراب شیرازی کا دور چل رہا تھا۔ سلطان خوش بیان کے ظہور سے میرے دل پر ایک ہیبت طاری ہوئی، مگر ساتھ ہی خوشی کا بھی اثر ہوا۔ اس کی نگاہ مومنی تھی کہ دل سے پیار آتا تھا، مگر ساتھ ہی ایسی تیز تھی کہ دل کا نپا جاتا تھا۔ میں اس کی طرف نظرِ غور سے دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنے تیروں کا ترکش لے کر مجھے دینے کا اشارہ کیا۔ میں نہایت خوش ہوا اور اس کے لینے کے لئے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا۔ مگر جو کرسی سے ٹکرایا تو دفعتہً آنکھ کھل گئی۔

(نیرنگ خیال)

فارس کے حالات
اور
فارسی زبان کے خیالات

آدم زاد کی تصویر جو صانعِ قدرت نے اوصافِ رنگارنگ سے سجائی ہے۔ اس کے جس رنگ پر عقل نظر کرتی ہے۔ دیکھتی رہ جاتی ہے، مگر سب میں زیادہ غور کے قابل اس کی زبان اور حسن بیان ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں زبان ہی ایک ایسی شے ہے جس سے اس کے بولنے والوں کی لیاقت یا جہالت، تہذیب و بے تہذیبی کا اندھیرا اجالا معلوم ہوتا ہے۔ غور کرو تو کسی قوم کی تحقیقی حالت اور حقیقی لیاقت اور طبیعت کی اصلیت ہمیں نہیں معلوم ہوتی اور تاریخ بھی ہمارے دل پر تصدیقی اور یقینی نقش نہیں کرتی۔ ہاں جو باتیں خود ان کے منہ سے نکلی ہیں اور کتابوں میں لکھی گئی ہیں۔ اگر وہ ہاتھ آ جائیں تو ان کے سارے کاروبار اور حالات وخیالات گویا اقراری تصدیق کو پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا عجب حال ہے۔ کسی ملک کا مسافر یا سیاح وہاں کے حال کو اپنے سفرنامے میں باتوں کا افسانہ بناتا ہے، یا سادہ لوح مورخ جو کچھ سنتا ہے اپنی تاریخ میں ایسی باتیں ایک قوم سے منسوب کر دیتا ہے جو اکثر خلافِ عقل کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہاں جب خود ایک زبان کے بولنے والوں کے اصلی الفاظ اور محاورے ایسے موجود ہیں جن سے ان کی خاص خاص رسومات اور سرگزشتوں کے نشان اور ان کے خیالوں کے رستے کھلے نظر آتے ہیں تو کون سی عقل ہوگی جو اس سے انکار کرے گی؟ اس تصور کا نمونہ ملک فارس اور زبانِ فارس کی حالت ہے۔ بہت افسوس ہے کہ اس ملک کی راہِ تواریخ میں سراغ بالکل مٹے

ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ نظم میں ہیں اور افسانوں کے لباس میں چھپے ہوئے ہیں۔ہاں یورپ کے علم زبان کے محققوں نے اپنے علم کے ذریعے سے اب اتنا پتہ لگایا ہے کہ یونان کی تاریخ سے بھی تقریباً ہزار برس پہلے، وہی شرافت پناہ فرقہ جو اریا کہلاتا ہے۔ بخارا خواہ تاتار۔ غرض وسط ایشیا سے اٹھا اور چاروں طرف عالم میں پھیل گیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشخاص مذکور قدوں کے لمبے، رنگ روپ کے گورے چٹے، باپ دادا سے اولوالعزم اور ہمت والے چلے آتے تھے۔ خود شائستہ تھے اور جانتے تھے کہ شائستگی کے کام اور راحت و آرام کے سامان کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی ایک شاخ نے اپنے خیالات کو مذہبی نقش و نگار دے کر 'نگار خانۂ چین' سجایا۔ دوسرے نے یونان میں جا کر فلسفہ و حکمت کا طوفان باندھا۔ تیسرے نے روما کی بنیاد ڈال کر روئے زمین پر حکومت شاہی اور حکمتِ عملی کا نقارہ بجایا۔ ایک شاخ نے اندلس میں جا کر کیسۂ خاک سے چاندی نکالی اور انگلستان سے خبر آئی کہ پانی سے مچھلیاں، بلکہ پہاڑ کے سینے کو چیر کر لوہا تک نکال لائے۔

ہندوستان میں ہمالہ اتر کر آئے اور برہمن دیوتا کہلائے۔ ایران میں شمشیر و گرز سنبھالا اور درفش کاویانی کو مرصع کر کے ہوا میں لہرایا۔ ممالکِ مذکورہ بالا میں الفاظ کا اتفاق ان کے اتحاد اصلیت پر گواہی دیتا ہے۔ ان میں بھی جو اتفاق الفاظ کا سنسکرت اور فارسی میں ہے غالباً کسی زبان میں نہ ہوگا چنانچہ گروہ در گروہ لفظوں کے انبوہ آواز بلند پکار رہے ہیں کہ ان دو خاندانوں کا نسب نامہ ایک ہے اور کہتے ہیں کہ قوم ہی کے نام سے ملک مذکور نے ایران نام پایا ہے۔ اسی کو یونان کی کتب قدیمہ 'آریان' پکارتی ہیں۔

'سیامک' جسے اہل ایران 'شت وخشور وخشوران'۔ برگزیدۂ یزدان۔ خدیو جہان۔ شاہنشاہ پیشداد کہتے ہیں۔ (بعضے کہتے ہیں کہ شیث پیغمبر وہی تھا) نیک نیتی اور داد و دانش کی برکت نے اسے پارسا خطاب دیا تھا اور اسی تقدس سے اس نے ملک مذکور کا نام پارس رکھا تھا کہ پاک اور مقدس کو 'پارس' کہتے ہیں (اور اسی سے ہے پارسا)۔

بعضے کہتے ہیں کہ 'پیشداد ہوشنگ' جس کے بااقبال اور روشن زمانے میں پتھر سے

آ گ نکلی اس کا لقب بھی پارس تھا اور اسے ایران شاہ بھی کہتے تھے۔ اس نے ایک شہر آباد کر کے اس کا نام ایران رکھا تھا۔ وہی اَدل بَدل کر آج نشاپور کہلاتا ہے اور ایران کے معنی 'پاک' اور 'پاکیزہ' بھی آئے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ فریدون ابن آبتن کے تین بیٹے تھے۔ جب سلطنت کی ترقی دل کے ارمان نکال چکی تو ملک کے تین حصے کئے:

(۱) ملک مشرقی تورج کو دیا۔ ایرانی اسے 'اَن ایران' کہتے تھے۔ عرب نے 'ماوراء النہر' اس کا نام رکھا۔

(۲) ملک مغربی سلم کو۔ اہل ایران اس کو 'ایران پژ' کہتے تھے۔

(۳) ملک وسطی ایرج کو دیا کہ اسی بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ یہ خطِ استوا سے جانب شمال اور ممالک ربع مسکون کے وسط میں واقع تھا۔ اسی واسطے مملکت کے کل شہروں میں معتدل اور خوش آب وخوش ہوا تھا۔

ہر قوم کا دستور ہے کہ اپنے ملک میں ایک مقام کو مذہبی برکت سے عظمت دیتے ہیں چنانچہ موسائیوں اور عیسائیوں نے بیت المقدس۔ اور عرب میں اکثر انبیا نے اور سب سے اخیر اسلام نے مکّہ کو معظم تسلیم کیا۔ ہندوستان میں کاشی، متھرا وغیرہ وغیرہ ۔ایران نے اس قطعۂ زمین کو متبرک سمجھا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ فریدون نے بھی اسے مقدس مقام اور اپنے با اقبال بزرگوں کا قدم گاہ سمجھ کر یہ ملک پیارے بیٹے کو دیا تھا اور اس میں سے قطعۂ خاص کو اعلیٰ اور روح افزا دیکھ کر پارس نام رکھا تھا (یعنی ارضِ مقدس) افسوس کہ ان خوبیوں نے اور باپ کی محبت نے بھائیوں کے دلوں میں عداوت کا خنجر ڈھالا اور دونے مل کر ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔ ایرج کی ماں کا نام ایران دخت تھا۔

کرمان شاہان کے پہاڑوں میں کوسوں تک پرانے ویرانے پڑے ہیں۔ وہ شاہان قدیم کے جاہ وجلال کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں۔ انہی میں ایک مقام 'طاق بستان' مشہور ہے اور دستکاریوں کے نقش ونگار میں ایک جگہ 'شاپور ذوالاکتاف' کی تصویر ہے۔

جو عبارت اس پر منقوش ہے ترجمہ اس کا یہ ہے:

بندۂ خدا شاپور عزیز شہنشاہ ایران واایران کہ بسلسلۂ آسمانی
پسر بندہ خدا ہرمزو عزیز شہنشاہ ایران واایران است وآں بسلسلۂ
آسمانی پسر بزرگِ شہنشاہ 'نرسی' است۔

اس سے مراد ہے۔ شاپور عزیز شہنشاہِ ایمانیاں وغیر ایمانیاں۔ کیونکہ 'ایر' (مومن) 'اَاِحر' (غیر مومن) کو کہتے تھے اور یہ معنی مُلّا فیروز پارسی نے مالکم صاحب کو بتائے تھے۔[1]

'نقش رستم' کے ایک کتابچہ کا ترجمہ ہے دارا بادشاہ ایران کی زبانی۔ میں شاہ و شہنشاہ دارا۔ کل آباد ملکوں کا بادشاہ۔ فراخ دنیا کا سنبھالنے والا۔ لکھامنش[2] پارسا کا بیٹا۔ بشتاسپ بادشاہ اور آرج کا بیٹا آرج ہوں۔ دیکھنا! یہ وہ دارا نہیں جسے سکندر نے مارا۔ یہ سنہ عیسوی سے 485 برس پہلے پیدا ہوا تھا۔

ہندوستان کے آریا بھی اپنے تئیں آرج[3] کہہ کر یہاں کے شودروں سے ارجمند کرتے تھے اور انہی کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیا چل تک آریاورت کہلاتا تھا اور تم ابھی سن چکے کہ فارسی قدیم کی کتابوں میں ایران کے معنی شریف و دانا و ہنر مند بھی لکھے ہیں۔ (یہی ارجمند کا ترجمہ ہے)۔

اکثر اہل یورپ انہی تحقیقاتوں کے لئے ممبئی اور خاندیس تک آئے۔ ایران بھی پہنچے۔ پارسیوں کے دستوروں اور موبدوں سے ان کی کتب قدیمہ بہم پہنچائیں۔ ساتھ ہی سنسکرت کی معلومات حاصل کی اور دونوں کو مطابق کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دنیا کی پرانی کتابوں میں وید سب سے پرانی کتاب تسلیم کی جائے تو پارس کے گاتھا ان سے دوسرے ہی درجے میں ہوں گے۔ ہزار بلکہ پندرہ سو برس پہلے سنہ عیسوی سے ان کی انشا پردازی درجۂ تکمیل کو پہنچی ہوئی تھی۔

---

[1] ملا فیروز وہی ہیں۔ جنہوں نے 'دساتیر' با ترجمہ و فرہنگ تصحیح کر کے چھپوائی تھی اور 'جارج نامہ' 3 جلدوں میں لکھا تھا۔

[2] دیکھو تمر ناسک۔ بابو سیوا پرشاد کا جغرافیہ۔

[3] ج سنسکرت میں حرف نسبت ہے۔ چنانچہ نیر سے نیرج (کنول کا پھول) اور آتما سے آتمج نکلا ہے۔

اس ملک کے جاہ وجلال، علوم وفنون اور تہذیب وشائستگی کی طرف ہر ملک کے مورخ عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن افسوس یہی ہے کہ وہ اپنی مسلسل تاریخ اپنے پاس نہیں رکھتا۔ کچھ مختصر بیان جن کی بنیاد شاعرانہ افسانوں پر ہے۔ مثلاً شاہنامہ، سکندر نامہ، زینت التواریخ وغیرہ وغیرہ ہیں اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو زبان کی اصلیت اور اس کے انقلابوں کا سلسلہ کب مسلسل ہاتھ آ سکتا ہے۔ باوجود اس کے یہ بالاتفاق ثابت ہے کہ ساڑھے چار ہزار برس سے کم اور چار ہزار برس سے زیادہ ملک مذکور میں اسی قسم کے بادشاہ اس دھوم دھام سے سلطنت کرتے رہے۔ جن کی تہذیب اور شمشیر اور دولت مندی نے کسی قوم کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

صحیح بخاری میں ایک جگہ اہلِ فارس کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ ابن ہمام صاحب فتح الباری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ شہسوار اور بہادر لوگ تھے۔ پھر مجوس ہو کر آتش خانے بنا لیے، لیکن ریاست، سیاست، حسنِ مملکت، تدبیر جنگ، ہر چیز کو برمحل برتنا، فنِ انشا، نفاستِ مزاج، لذیذ کھانوں اور خوشبوؤں کی ایجاد اور خوش لباسی میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ رسوم ملک داری میں اور لوگ ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

جب یہ بات ثابت ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایسی باعظمت اور قدیمی سلطنت کیا علوم سے بے بہرہ ہوگی؟ یا فنون وصنائع کی دولت سے محروم ہوگی؟ اس کی زبان علمی الفاظ کے اعتبار سے ناتمام ہوگی؟ اور نظم کے گلزار سے خالی ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ جس آریا قوم کی ایک شاخ نے ہندوستان میں آ کر علم کے دریا بہا دیے کیا دوسری شاخ نے وہاں جا کر بزرگوں کا نام ڈبویا ہوگا؟ نہیں نہیں، اور ہرگز نہیں۔ تب کیا آفتِ آسمانی آئی جس کے سبب سے ایسے مہذب لوگ، ایسے علوم وفنون کے خزینہ دار، جاہ وجلال کے سپہ سالار اس حالت میں نظر آنے لگے جسے اور نقصانوں کے ساتھ آج لوگ کہتے ہیں کہ ''فارسی زبان علمی زبان نہیں۔'' اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو کہانیوں کی آخر سلطنت میں زرتشت کے نئے دین اور نئے آئین نے صدہا برس کی رسوم اور علوم اور اس کی کتابوں کو خاک سیاہ کیا۔ تم ضرور کہو گے کہ مذہب کا زبان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ اس تغیر کو خیال

کرلو جو کہ بودھ کے سبب سے سنسکرت پر ہوا۔ دیکھ لو سنسکرت کے دین آئین سب بدل گئے تھے۔ کتب خانے نیست و نابود ہو گئے تھے۔ غاصبوں کی زبان جو ایک پراکرت زبان تھی وہی بودھ قادرِ مطلق کی زبان کہلاتی تھی۔ وہی ازلی اور ابدی قرار پائی تھی۔ پالی حروف دفتروں سے لے کر کتب مذہبی تک حرفِ الٰہی ہو گئے تھے۔ نئے کتب خانے سج گئے تھے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ جب زرتشت نے بادشاہِ وقت (یعنی گشتاسپ) اور ولی عہد (یعنی اسفندیار روئیں تن) اور تمام خاندانِ شاہی اور امرائے دربار کے دلوں پر آگ کی روشنی سے دینِ الٰہی کا جلوہ دیا ہوگا تو قدیمی رسوم ورواج سے باقی کیا چھوڑا ہوگا؟ زرتشت نے روما سے علوم حاصل کئے تھے اور اضلاعِ شام سے خروج کیا تھا۔ کچھ نہ کچھ مزہ ضرور زبان پر آیا ہوگا۔

غرض دین زرتشت نے سلطنت کے بازوؤں سے ایسا زور پکڑا کہ تمام ایران وخراسان پر چھا گیا اور تخمیناً دوسو برس تک اطراف وجوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور کہتا ہوا اٹھا کہ:

نہ آتش گزارم نہ آتش کدہ　　شود ہر دو از دستم آتش زدہ

جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے ہندوؤں پر گزری تھی وہی وہاں 'ژندو' استا' پر آئی۔ افسوس جس آگ نے زرتشت اور جامہ سپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج کیانی سر سے اتارا۔ اسفندیار روئیں تن نے گزر و شمشیر نذر چڑھائے۔ وہ آگ آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔ ژندو پاژند کے ورق ورق برباد کئے۔ سکندر نے شراب کے نشے میں شہر استخر[1] کو آگ لگوادی۔ تاریخ کے سینے پر آج تک داغ ہے۔ اس شہر کا کہ تخت گاہ ملک جم کا تھا اور پشتوں سے مقام شاہ نشین سلاطین ایران زمین کا چلا آتا تھا۔ غضب ہوا کہ اس کا عظیم الشان کتب خانہ آگ

---

[1] یونانی مصنف اسے 'پرسی پولیس' لکھتے ہیں۔ پرسی = پارس + پولیس = قلعہ کو جمشید کے اقبال کے بلند پہاڑ پر بلند کیا تھا۔ اس کے کھنڈر اب تک پرانے جاہ وجلال کو عظمت دیتے ہیں۔ استخر = تلاؤ کو کہتے ہیں۔ اس میں پہلے بہت بڑا تلاؤ تھا۔ شیراز سے اصفہان کو جاتے ہوئے دوسری منزل میں رستہ سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ انشاء اللہ سفرنامہ میں مفصل لکھوں گا۔

کا نذرانہ ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یونانیوں نے جب ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر کیوں نہ زور دکھایا ہوگا۔

سکندر کے تھوڑے ہی دنوں بعد پارتھیا والوں کا عمل ہوگیا۔ جس ایران کو ہزاروں برس سے فتح کے نشان سلامی اتارتے تھے اور فتح یابی دربار میں سر جھکاتی تھی 500 برس تک نئے ظفر یابوں کے قبضے میں دبا رہا اور زند کی مقدس کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کیں۔ آخر 226ء کے بعد 500 برس کے مردے میں اقبالِ ساسانی سے سانس پڑا اور دم شمشیر سے تنِ بے جان میں جان آئی۔ اردشیر بابکاں خاندانِ مذکور کا بانی تھا۔ اس نے ملک ومملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کے نور کو بھی روشن کیا۔ آتش خانے پھر تعمیر کئے۔ مذہب مٹ گیا تھا، کتابیں ضائع ہوگئی تھیں۔ لوگوں کی زبانوں سے یا جن جن مقاموں سے پھٹے پرانے اوراقِ پریشاں ہاتھ آئے انہیں سمیٹ کر پھر مذہب کی شیرازہ بندی کی اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہوا۔ اردشیر ایسے ذوق وشوق بلکہ سخت جوش وخروش سے ملک اور قوم کے کام میں مصروف ہوا کہ مورّخ اس کو تعصّب اور سخت مزاجی کی تہمت لگاتے ہیں اور یہ جرم ممکن ہے۔ کیونکہ پارتھیا والوں کے کئی سو برس کے جمے ہوئے رنگ کو مٹا کر اپنا نقشہ جمانا اور ان سے بھی پہلے سکندر کی اُکھیڑی ہوئی بنیادوں کو چُن کر نئی عمارت کا اٹھانا، سختی کے بغیر کیونکر ہوسکتا تھا۔ اس خاندان نے پانسو برس بادشاہی کی۔ اہل فارس کو اس سلسلے کی سلطنت کا بھی فخر ہے اور فی الحقیقت اردشیر، شاپور، نوشیرواں جیسے بادشاہ جس خاندان میں نیک نامی کے نشان بلند کریں ان کی قوم جو ناز کرے بجا ہے۔

ساڑھے چار سو برس کے بعد ریگستانِ عرب سے ایک آندھی اٹھی۔ اس کے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیر اسلام کی قربانی ہوگیا اور درفش کاویانی قادسیہ کی خاک پر سرنگوں ہوا۔ اللہ اللہ، یہ وہی مبارک چمڑا تھا جس کے اقبال سے ضحاک کی بلا دفع ہوئی تھی اور کیانی خاندان کا حقدار اپنے حق کو پہنچا تھا۔ وہ ہر میدان میں فتح کا ستارہ ہوکر چمکا اور اس کی برکت پر پھولوں کی جگہ جواہر اور

موتی چڑھائے گئے تھے۔اس کے شگون پر جنگ کے معرکوں میں امیدوں کی آنکھیں لگی ۔ ن تھی۔ آج وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا اور دیندار بہادروں میں اس کے جواہرات اور موتی مٹھی مٹھی کھجوریں تھیں کہ بٹ گئیں۔ عالی شان آتش خانے ڈھائے گئے۔ان کی نورانی آگ خاک کے نیچے دَھم ہوکر رہ گئی۔ دینی اور دنیاوی کتابیں ورق ورق اڑیں اور جل کر خاک درخاک ہوگئیں۔ اس وقت میں میرے پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمانوں کو بھی بچالائے۔ چنانچہ مدراس اور ممبئی کے ملکوں میں آ کر پھر آتش خانے بنائے اور اپنے بزرگوں کے نام کو روشن کیا۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس موجود ہے وہ ٹوٹا پھوٹا بقیہ ہے جو کئی صدموں کے بعد بچا ہے(۱) یونانیوں کا طوفان (۲) پارتھیا والوں کی 500 برس کی سلطنت جس کی پریشانی کو ساسانیوں کی ہمّت نے فراہم کیا تھا (۳) عرب کا حملہ جس کے بعد پھر پارسیوں کو جمعیت نصیب نہ ہوئی۔ اب پارسی بھائیوں نے اپنے گھروں میں آگاہی کے لمپ جلائے تو روشن ہوا کہ ژند کے 25 باب تھے۔ان میں سے ایک وندیداد انیسواں باقی ہے اور متفرق اوراق یا فصلیں ہیں کہ زبانوں یا سینوں میں امانت آئے تھے۔ انہی میں کتاب زورہ استا ہے۔ اس میں بہت سی دعائیں وظائف کی ہیں۔ ایک ایرانی محقق کہتا ہے کہ زورہ وہی لفظ ہے جو قرآن میں سورہ ہوکر لکھا گیا ہے۔

ہماری معلومات کو پارسی بھائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کیونکہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے انہی کی برکت سے پہنچا ہے۔اسی سے ہم پر دو پرانی نسلوں کی ایک اصل ثابت ہوئی۔ اسی سے دو زبانوں کے لغات کا رشتہ نکل آیا اور اس سے ان کی خاندانی رسموں کی بلکہ اتحاد مذہب کی حقیقت معلوم ہوئی اور یہ بھی خبر ہوئی کہ سنسکرت کے بعد ژند ہی زبان ہے جو قدامت کا تمغہ اپنے پاس رکھتی ہے اور وہ قوانینِ زبان اور اصولِ صرف ونحو اور طرزِ بیان اور سلاست اور فصاحت میں اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ یورپ کے محققوں نے بھی اس کے رتبے کو تسلیم کیا ہے۔

ان کے علوم وفنون پر بار بار ادبار کے طوفان آئے پھر بھی جو کچھ باقی ہے اس کے

مطالب خبر دیتے ہیں کہ ہم کس دریا کے قطرے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جہاں ہم تھے وہاں سب کچھ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے پارسی بھائی خانہ برباد ہوکر ادھر آئے اور ان کی خورجینوں میں زیادہ تر فلسفۂ الٰہیات اور مذہبی کاغذات کے پُرزے تھے۔ سچ ہے ایسے وقتوں میں خدا یاد آتا ہے اور ایمان والوں کے ساتھ ایمان ہی جاتا ہے۔ ان کے مطالب بھی دیکھو تو معلوم ہوگا کہ علم مذکور کس اوج رفعت پر تھا۔ ان کی علمی اصطلاحیں جب عربی کی اصطلاحوں سے مطابقت کرتا ہوں تو بازارِ دنیا کے لین دین کا تماشا نظر آتا ہے۔

ابھی دیکھتا ہوں کہ دارا کی لوٹ میں سکندر علم کے صندوق بھی لئے جاتا ہے اور ان سے یونان وروم کے مدارس اور کتب خانوں کو افزائش دیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دیکھتا ہوں کہ عرب کے بہادر قطار در قطار اونٹ کچھ اُدھر سے لادے لئے آتے ہیں ، کچھ فارس سے لئے جاتے ہیں اور اس سے بیابانِ ریگستان کو آباد کررہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد دیکھتا ہوں کہ انہوں نے فارس کو اپنا سرمایہ دے دیا۔ مگر امانت دار تھے، جو کچھ لیا، جوں کا توں حوالے کردیا ہے۔ خود اپنے ریگستانوں میں ویسے ہی رہ گئے جیسے کہ تھے۔

ایران میں طلبا کو کتب الٰہیات عربی زبان میں پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ دیکھو! خاک ایران کے فرزندوں کو اپنے بزرگوں کے مال کی خبر نہیں۔ یہ ان کے علوم، ان کے ہی مطالب، ان کے ہی دلائل ہیں۔ اور عرب کے استادوں سے عربی الفاظ میں سیکھ رہے ہیں۔ کسی کو خیال نہیں آتا کہ یہ ہمارے گھر کا مال ہے۔ ایک زمانہ ہوگا کہ یہ مطالب اسی خاک پر اپنے الفاظ میں پھیل رہے ہوں گے:

ماہیت	= ہرایند بروزن سرا	علت غائی	= کرانی
عقل اوّل	= مہین ہوش		
علّت	= ایرایہ	واجب	= بایست
علت مادّی	= مایی	ممکن	= شایست

علّت صوری	= پیکری	ممتنع	= نا بایست
علّت فاعلی	= کاری	فرض	= شمر۔ کرف
جنس	= مہ گونہ	قدیم	= باش
نوع	= گونہ	حادث	= رستہ۔ نورستہ
فصل	= باز آر	نسب	= پر بند
خاصہ	= وِیژ	ذہن	= بارُبد
بسیط	= اَدَر۔ وہ کسی میں اور کوئی اس میں نہیں		
مرکب	= دربست۔ دروبست۔ کاموس		
دعویٰ	= خواست	برہان	= روشنگر
مفرد	= اوربست۔ نادربست	دَور	= گیزَدَہ
حد	= وَاوار	تسلسل	= رَورَو
جوہر	= گوہر	برہان تطبیق	= برہم روشنگر
عرض	= پیان = پے + ان	برہان سلّمی	= زینہ روشنگر
اشارہ	= نماک۔ نمودن سے ہے	وغیرہ	= وغیرہ
مطلق	= آزاد = یلہ	نقطہ	= داغک
ملکہ	= راد۔ زہ	خط	= کشک

غرض کہ ان الفاظ اور ایسے ایسے دلائل سے اثبات واجب الوجود کا اور ابطال ایک سے زیادہ واجب الوجود کا۔ نفس ناطقہ کا بسیط ہونا، اس کا فانی نہ ہونا، غیرہ وغیرہ صد ہا مسئلے الٰہیات کے اور اصلاح نفس کے۔ رنگا رنگ بیانوں سے ادا کئے ہیں۔

ساسان پنجم کے فضائل وکمالات میں لکھا کہ اس کے مباحثے کے ارادے سے ایک فلسفی کامل مصر سے چلا اور ساسان آباد میں پہنچا۔ جس مدرسے میں ساسان پنجم درس دیتا تھا وہاں کے دربان کے گھر میں ایک لونڈی تھی۔ اتفاق یہ کہ فلسفی مصری رات کو اس لونڈی کے شوہر کے گھر میں اترا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اس گھر کو میرے حریف سے کیا علاقہ

ہے۔ رات کو لونڈی کی ماں نے مہمان سے پوچھا کہ میاں مسافر تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟ اور یہاں کس ارادے سے آئے ہو؟ چھوٹا سفر (حرکت جسمانی) بڑے سفر (سفر آخرت) کے سامان کے لئے چاہیے نہ کہ دنیا کے نفع کے لئے۔ کیونکہ یہ ناپائدار ہے اور اس کا تعلق اصلی ٹھکانے تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ مصری فلسفی سن کر حیران ہوگیا۔ ناچار علم کی آڑ میں چھپا اور کہا کہ ''تلاشِ علم''۔ پھر عورت سے پوچھا کہ ''واجب کا فعل قدیم ہے یا حادث؟'' عورت بولی۔ ''حادث وہ ہے کہ زمانی ہو اور زمانہ فلک الافلاک کی گردش کو کہتے ہیں۔ چونکہ واجب اس سے برتر ہے تو چاہیے کہ واجب قدیم ہو اور اس کا فعل بھی قدیم ہو۔'' حکیم مصری نے پوچھا کہ ''واجب تک بھی فنا پہنچ سکتی ہے؟'' عورت نے کہا۔ ''نہیں! اس لئے کہ ممکنات موجود ہیں اور یہ بدون فاعل کے موجود نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ معلول بدون علّت کے نہیں رہ سکتا۔'' حکیم نے اعتراض کیا کہ ''باپ بیٹے کی علّت ہے۔ باپ مرجاتا ہے بیٹا جیتا رہتا ہے۔'' عورت نے کہا ''باپ بیٹے کی علّت نہیں۔ وہ اس کے سبب کا ایک جز ہے نہ کہ علّت! دیکھتا نہیں؟ ماں بانجھ ہوتی ہے تو باوجود باپ کے بچہ نہیں ہوتا اور واجب الوجود تو علّت تامہ ہے۔ جب تک وہ ہے تب تک سب کچھ ہے وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔'' غرض کتب مذکورہ میں سے جو رسالے فارسی میں ترجمہ ہوگئے اور میری نظروں تک پہنچے ہیں ان میں صدہا مسائل الٰہیات اور فلسفہ کے ہیں کہ کہیں فلاسفۂ یونان سے مطابق ہیں اور کہیں ان کا پہلو توڑ جاتی ہیں۔

ریاضی اور اس کی تمام شاخیں صفا صفا ہوگئیں۔ دساتیر میں ایک جگہ سیاروں کے دَور اوغیرہ اور ان کی شمار بتائے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہیئت تھا اور بہت بلند رتبے پر تھا۔

ان کے ہندسے کی مفلسی آج رحم کے قابل ہے کہ ہزار سے زیادہ مرتبہ اعداد بھی نہیں بتا سکتا۔ مگر دساتیر میں انہی سیارات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مراتب اعداد کا شمار معمولی حد تک ضرور تھا اور جبکہ 'نقطہ' کو 'داغک' اور 'خط' کو 'کشک' کہتے تھے تو ان

کے استعمال کے مقام ومحل بھی ضرور ہوں گے۔

جغرافیہ کی کوئی کتاب نہیں نظر آتی مگر تقسیم روئے زمین کے بعض مطالب جو کہیں کہیں لکھے ہیں اور ان سے اکثر اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں وہ سراغ بتاتی ہیں کہ ایک زمانے میں بھاری ذخیرہ ہوگا۔

کرہ زمین = گوے چغمینی

قطب شمالی = اواختر

قطب جنوبی = وراختر

خطِ استوا = میانکش

دنیائے قدیم = رُزہ۔رُوزہ۔ کیونکہ اس کا حال روشن ہے

نئی دنیا = شوہ۔شبہ۔اس لئے کہ اس کا حال لاعلمی کی رات میں مخفی ہے

یہ اصطلاحیں اب تک بھی بہت باقی ہیں مگر ان کے بیان کا یہ موقع نہیں پھر بھی یہ کہنا ضرور ہے کہ ان کے کاروبار اور نام ونشان جو باقی چلے آتے ہیں اپنے وجوہات بھی ساتھ دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ عہد قدیم میں سیستان کو نیمروز کہتے تھے۔ کیونکہ جب وہاں آفتاب نصف النہار پر آتا ہے تو پورا نصف کرہ زمین کا روشن ہوجاتا ہے۔ اس وقت جزیرہ مدیر (مغربی ساحل، بحرمحیط) والوں کو اول طلوع اور جاپان (مشرقی ساحل بحرمحیط) والوں کو غروب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب 'ژندو' استا' میں حمدِ الٰہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ کوہ سپند (سیستان) پر دوپہر ہوتی ہے تو 12 ہزار شہروں پر آفتاب کا نور پھیلاتا ہے۔ (لطیفہ) 12 ہزار شہروں کا حال تو اسی کو معلوم ہوگا۔ اتنا اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ نصف کرہ زمین کا دور 12 ہزار میل ہے۔

ان کی دستکاری اُن عماراتِ قدیمہ سے نمودار ہے جو کہ کوہ بیستون، طاق بستان، نواح کرمان شاہان وغیرہ وغیرہ مقامات میں کھنڈر پڑے ہیں:

از نقش ونگارِ درودیوارِ شکستہ آثار پدیداست صنادید عجم را

یا قدیمی سکوں اور پرانے نگینوں سے معلوم ہوتی ہے جو کہ خزانۂ خاک سے کہیں

کہیں نکل پڑتے ہیں۔ ایران خراسان تک انہی کی تواریخ کا گورستان ہے۔ قصر شیریں اور خرابہ شاپور۔ خرابہ استخر کہ شیراز کے پاس ہے اور اس کے علاوہ اکثر پہاڑوں میں شاہانِ قدیم کی شکارگاہیں وردربار منقوش ہیں۔ سواری اور سواری کے جلوس اور فوجیں چلی جاتی ہیں۔ ان سے فقط صنعت اور دستکاری کی باریکی ہی نہیں روشن ہوتی بلکہ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے جو یکساں اور دیاں پہنے جاتے ہیں، وہ خبر دیتے ہیں کہ ہمارے ملک کی جنگی فوج باقاعدہ تھی اور ہم قواعدِ جنگ کو علمی اصول سے کام میں لاتے تھے۔

'طاق بستان' کی تصویروں میں ایک مقام پر شاپور اور اس کا باپ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک حلقے کو دونوں پکڑے ہیں۔ اس سے کرہ زمین کا اشارہ ہوگا۔ ایک طرف زرتشت کی تصویر ہے۔ اس کے چہرے سے پرنور آفتاب کا تاج شعاعیں پھیلاتا ہے۔

کنارۂ خراسان سے لے کر ادھر غزنی اور کابل تک۔ اُدھر بلخ اور اس سے آگے کنارِ جیحوں تک عجیب وغریب یادگاریں عہدِ قدیم کی نظر آتی ہیں۔ شاہانِ کیانی کی بزم گاہوں کے نقشے اور رزم گاہوں کے معرکے خاک پر مٹے پڑے ہیں۔ کابل سے چل کر بامیان اور بلخ کے درمیان میں دونوں طرف بلند پہاڑ دیواروں کی طرح چلے جاتے ہیں۔ بیچ میں فراخ اور سیدھا شاہراہ ہے۔ کہیں دوطرفہ کہیں دائیں، کہیں بائیں، دومنزلہ سہ منزلہ مکانوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح تراشا ہے جیسے کوئی صابون یا چربی کی ڈلی کو تراشتا ہے۔ استحکام واستواری کا تو کیا کہنا ہے۔ طرزِ تعمیر اور نقش ونگار دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور وہاں کے ہزاروں اور افغانوں کے کلام کو تصدیق کرنا پڑتا ہے کہ کہتے ہیں۔ یہ دیوزادوں کا کام ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے حکم سے بنائے ہیں۔ شمار میں 14-15 سو سے کم نہ ہوں گے۔ انہیں 'سمج' کہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک عمودی پہاڑ کی سل میں ایک بت تراشا ہوا ہے۔ جس کا 40 گز کا قد ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا نام سلسال ہے۔

ایک عورت کی تصویر ہے اس کا قد 25 گز بلند ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس کی بی بی ہے اس کا نام شمامہ۔

ایک بچہ ہے اس کا ساڑھے سات گز کا قد ہے۔ نام معلوم نہیں ہوا۔ ان مورتوں کے تناسب اعضا، خط وخال، زیور اور خوشنمائی آج تک سیاحوں سے اپنے دستکاروں کے لئے تعریفیں لیتے ہیں۔

رستے سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ کو قلعہ ضحاک ویران پڑا ہے۔ اسے شہر غلغلہ کہتے ہیں۔ اس کی فرسودہ فصیلیں اور بے شمار برج وکنگرے دور سے اداسی اور مایوسی کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں خرابے اور ویرانے گمنام پڑے ہیں اور شہر کے شہر ہیں کہ زیرزمین مدفون ہیں۔ جابجا پرانے زمانے کے پیسے، روپے، اشرفیاں اور نگینے نکلتے ہیں۔ ان پر ایرانی، یونانی اور ہندوانی سکّے اور تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ معمولی اور غیر معمولی سیکڑوں چیزیں اگلے وقتوں کی ایسی نکلتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ رباعی

دُنیا خوابیست کش عدم تعبیر است
صیدِ اجل است گر جواں در پیر است
ہم روئے زمیں پر است وہم زیرِ زمیں
ایں صفحۂ خاک ہر دورو تصویر است

بلخ خاص دارالسلطنت ان بادشاہوں کا تھا۔ یہ باختر زمین اور ادھر مقابل میں خراسان زمین۔ 'باختر' کو یونانیوں نے 'بیکٹریا' بنادیا۔

قندھار اور غزنی کا علاقہ زابلستان کہلاتا تھا۔ رستم حامی ایران کا وطن یعنی سیستان انہی علاقوں میں ہے۔ بلخ کے رستے میں بائیں ہاتھ چند کوس کے فاصلے پر ایک مقام 'تخت رستم' کہلاتا ہے۔ وہ اس دشت میں آ کر شکار کھیلا کرتا تھا۔ ایک سنگِ سیاہ کی چٹان ہے۔ اُسی کو تخت رستم کہتے ہیں۔ مالکم صاحب کہتے ہیں:

''سیستان خاندان رستم کا ملک موروثی ہے۔ اگرچہ تمام بیابان ہے اور اکثر نیستان ہوگیا ہے۔ لیکن کھنڈر اور خرابے اور ویرانوں کے نشان گواہی دیتے ہیں کہ دریائے ہیرمند کے کنارے کنارے دور تک

آبادی کو رونق دیتا چلا جاتا تھا۔ اور مقاموں اور قبیلوں کے نام وہاں کے تاریخی حالات کی تصدیق کرتے ہیں۔ایک افسر انگریزی نے 1810ء میں علاقہ مذکور میں سیاحت کی ہے۔اس نے سیستان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شہر مذکور اپنے ویرانوں اور خرابوں کے بموجب چاہیے کہ کسی زمانے میں اصفہان کے برابر پھیلا ہوا ہو اور یہ شعر مشہور کی طرف اشارہ ہے''۔

اصفہاں نیمۂ جہاں گفتند

نیمۂ وصف اصفہاں گفتند

ان کی مہمان نوازی، ان کے آدابِ محفل، ان کی تعظیم وتکریم کے طریقے، ان کے گھروں کی آرائش آج تک علم 'تدبیر المنزل' کے لئے نمونہ ہیں کہ کسی آئندہ لکچر میں ان کی تصویر کھینچ کر دکھاؤں گا۔

(سخن دانِ فارس)

میان ناصر علی سرہندی

ناصری نام علی تخلص۔ اگر چہ سرہندی[1] مشہور ہے جو کہ پٹیالہ کا علاقہ ہے۔ مگر درحقیقت لاہور کا رہنے والا تھا۔ چونکہ نہ خود ولایت زا تھا نہ قریب العہد ولایتی زادہ تھا۔ ہندوستانی ہونے کے سبب سے اہل تصنیف اس کو میاں ناصر علی لکھتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ نازک خیالی اور معنی یابی میں بے عدیل تھا مگر مشکل ہے کہ خیال کرتے کرتے ایسا خیال میں غرق ہوا ہے کہ بعض جگہ بالکل شیخ خیالی ہو گیا ہے اور اکثر معنی کی تلاش میں ایسا ڈوبا ہے کہ بے معنی ہو گیا ہے۔

خان آرزو کہتا ہے کہ شعرائے فارس کے چند طبقے ہیں:

(1) رودکی، اسدی طوسی، فردوسی طوسی وغیرہ۔

(2) نظامی، انوری، خاقانی، کمال اسمٰعیل وغیرہ کہ ان کے کلام میں بہ نسبت طبقۂ اول کے کچھ فرق ہے۔

(3) سعدی، خواجہ حافظ، امیر خسرو، جامی وغیرہ انہوں نے پہلی طرز میں کچھ اور تبدیلی کی۔ ان کے بعد ایک اور طبقہ پیدا ہوا کہ ان کے کلام میں رنگینی اور نزاکت زیادہ تھی وہ طبقہ۔

(4) عرفی، ظہوری وغیرہ ہیں۔ صائب بھی اگر چہ انہیں میں ہے مگر اُس نے کچھ اور عالم پیدا کیا۔ انہیں لوگوں میں جلال، اسیر اور قاسم مشہدی اور زلالی وغیرہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی طرز کا نام عالم خیال اور عالم معنی رکھا۔ یہاں تک کہ اسی میں خود بے معنی

---

[1] سرہند کی پیدائش تھی مگر دلی میں پرورش پائی۔

ہو گئے۔ اور چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں شعرائے ہند کے صاحب طبع لوگوں میں سے بھی بعض بعض لوگ اُس رستہ پر گئے چنانچہ شاہ ناصر علی اور بیدل اور ارادت خاں واضح وغیرہ انہیں لوگوں میں ہیں۔ بزرگوں کی زبانی سنا گیا ہے کہ شیخ علی حزیں ان کے کلام کو سُن کر کہا کرتے تھے کہ از نظم ناصر علی ونثر بیدل ہیچ بفہم نمے آید اگر بایران مے رفتم برائے ریشخند یاراں رہ آوردے ازیں خوبتر نبود۔

کہتے ہیں کہ پہلے پہلے ناصر علی بہت متقی اور پرہیز گار تھا مگر پھر خدا جانے کیا سمجھ میں آیا کہ شریعت کے دائرہ سے نکل کر بے قید مطلق ہو گیا۔ بعض کا قول ہے کہ عالمگیر بادشاہ نے اُسے بلایا تھا اسے وہم ہوا کہ خدا جانے کیوں بلایا ہے اس لئے جنون کا بہانہ کر کے کنارہ کیا۔

محمد افضل سرخوش پانی پتی اور مرزا بیدل اس کے ہمعصر اور ہم صحبت اور ہم مشق تھے۔ سرخوش اُس کی نہایت تعریف کرتا ہے۔ اُسے آبروئے ہندوستان لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ افسوس ہے بے فیض زمانہ میں پیدا ہوا اس لئے اپنی لیاقت کے لائق عزت نہ پائی۔ کہتا ہے کہ میں نے اور اُس نے لڑکپن سے ساتھ مشق سخن کی اور ساتھ لکھتا پڑھتا رہا۔ مگر ؎

طاع شہرتِ رسوائی مجنوں بیش است
ورنہ طشت من وادہر دوز یک بام افتاد

ایک دفعہ ابتدائے مشق میں میں نے اُس سے کہا کہ ان دنوں بعض امرا کی صحبت میں گفتگو ہوتی تھی کہ یہ لوگ استادوں کی غزلوں کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ آؤ امتحان تو آسان ہے ایک غزل ہم تم طرح کریں۔ اتفاقاً اُن دنوں میں یہی طرح درپیش تھی۔ آب استادہ است آفتاب استادہ است۔ سرخوش کہتا ہے کہ پہلے میں نے گھوڑا میدان میں ڈالا ؎

تن زشکم تا بہ گردن غرق آب استادہ است
سر بروئے آں عیاں ہمچوں حباب استادہ است

حسن مطلع ناصر علی نے کہا ۔

اہل ہمت رابنا شد تکیہ بر بازوئے کس
خیمہ افلاک بے چوب وطناب استادہ است

ایک مثنوی یوسف زلیخا کی بحر میں کہی ہے۔ اگر چہ سر خوش بہت تعریف کرتا ہے مگر اصل یہ ہے کہ نزاکت معانی اور لطف الفاظ کے سبب سے مطالب کا پتہ نہیں لگتا ۔

بگفتم یک شب از خندیدن گل
کہ دیرِ سومناتم بود منزل

بتے بتے میگفت پنہاں بابرہمن
خدائے من توئی اے بندۂ من

مرا برصورتِ خود آفریدی
بروں از نقشِ خود آخر چہ دیدی

اسی مثنوی میں وارستہ مزاجوں کی تعریف میں کہتا ہے ۔

بدنیاؤ بہ عقبٰی درستیز اند
چو برق از ہر دوجانب درگریز اند

سر خوش کہتا ہے کہ پرانے دوستوں میں سے ایک بڈھا ہے کہ نام اُس کا لینا اُس کے لئے موجب رسوائی ہے اُس نے اس مثنوی کے مطلع میں اصلاح دی ہے۔ اصل مطلع:

الٰہی ذرۂ دردے بجاں ریز
شرر در پنبہ زار استخواں ریز

اصلاح

الٰہی ذرۂ دردے بہ تن ریز
شرر در پنبہ زار سوئے من ریز

سرخوش کہتا ہے ؎

من ایں حرف از زبانش چوں شگفتم
چوگل خندیدہ برویش بگفتم

چرا ایں حاجت از حق خواہی اے یار
توانم کردمن ہم ایں قدر کار

کہ مشتے خس بآتش برفروزم
ہمہ موئے سروریشت بسوزم

سزائے آنکہ در شعر بلندی
کند زیں گونہ دخلِ ناپسندی

مناسب تر دریں ہنگامہ افتاد
برِ اہلِ سخن ایں بیت استاد

چراغے را کہ ایزد برفروزد
ہر آنکس پُف زند ریشش بسوزد

سرخوش اُس کی تعریف میں کہتا ہے ؎

در ملک سخن بود جہانگر علی
در مشرب دل دلی علی میر علی

یا شعر علی نمیر سد شعر کسے
زانساں کہ خطِ کس بخطِ میر علی

ایک دن اِن کے کپڑے بہت میلے ہوگئے تھے گھاٹ پر گئے کہ دھوبی سے

دُھوالائیں۔اُس نے مزدوری مانگی۔انہوں نے کہا کہ بھائی تم کپڑے دھوؤ۔اس عرصہ میں جو کچھ مجھے خدا دے وہ تمہارا۔ان کے انداز کو دیکھ کر دھوبی بھی کچھ سمجھا اور کپڑے دھونے لگا۔ایک شخص کہ کسی دور دراز شہر کا رہنے والا تھا اور ان کے کلام کو سُن کر غائبانہ معتقد ہو گیا تھا۔اتفاق آب ودانہ اسے دلّی لایا۔وہ لبریز اشتیاق جب گھاٹ پر آیا تو پہلے یہی پوچھا کہ ناصر علی شہر میں کہاں رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بھائی وہ ایک دیوانہ باؤلا آدمی۔تم صاحب جاہ وحشم معلوم ہوتے ہو۔اُس سے مل کر کیا لو گے۔غرض اسی قیل وقال میں اُسے معلوم ہو گیا کہ حضرت آپ ہی ہیں۔پہلی ملاقات تھی سردست اُس نے چند اشرفیاں کمر سے کھول کر نذر دیں۔انہوں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دھوبی کے حوالے کر دیں۔

(دیکھو تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم)

نواب ذوالفقار خاں سپہ سالار عالمگیر کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر لے گیا مطلع ہی پڑھا تھا کہ ذوالفقار خاں نے ایک لاکھ روپیہ مع خلعت وجواہر انعام دیا اور کہا کہ دوسرا شعر نہ پڑھئے کہ میرا خزانہ اِن جواہرِ مضامین کی قیمت کے لئے کافی نہیں اور ہاتھی پر سوار کر کے رخصت کیا۔وہ مطلع یہ ہے۔

اے شانِ حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو درنبرد کند کار ذوالفقار

کہتے ہیں کہ ناصر علی جب وہاں سے نکلا تو اوّل انعام کے لئے نواب کے ملازم اور پھر رستے میں لوگ گرد ہو گئے۔اس نے بھی ہاتھی ہی پر سے بیٹھے بیٹھے تمام روپیہ لٹانا شروع کیا۔جب مکان پر پہنچ کر اُترا تو فیل بان نے کہا کہ میرا انعام بھی مرحمت ہو۔اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔جاؤ یہی ہاتھی تمہارا انعام ہے۔

(نگارستان فارس)

شیخ عبدالقادر بدایونی امام اکبر شاہ

امام اکبر شاہ کہلاتے تھے اور علمائے عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے۔ ترجمہ اور تالیف میں اکبر کی فرمائشوں کو عمدہ طور پر سرانجام کرتے تھے۔ اسی خدمت کی بدولت ان کے جواہر معانی صفائی بیان کے ورقوں میں جگمگائے اور ان کی کثرت تصانیف اپنی عمدگی سے الماری کے درجۂ اول پر قابض ہوگئی۔ جو تاریخ کہ ہندوستان کے حالات میں لکھی ہے۔ وہ اکبر کے دربار اور اہلِ دربار کے حالات سے تاریخی عبرتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مہماتِ سلطنت اور کاروبار زمانہ کو خوب سمجھتے تھے۔

فاضل مذکور میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص کے خصائل اور جزوی عادات اور اطوار کو چنتے ہیں اور اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ جب پڑھو نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اہل ذوق دیکھیں گے اور جہاں تک ممکن ہوگا میں دکھاتا جاؤں گا کہ وہ امرائے دربار میں جس کے برابر سے نکلتے ہیں ایک چٹکی ضرور لیتے جاتے ہیں۔ امرائے دربار سے ان کا اس قدر بگاڑ نہ ہوتا۔ مگر اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے ملائی کے دائرے سے قدم نکالنا نہ چاہا اور اسی کو دنیا کا فخر اور دین کی دولت سمجھا۔ انہیں کبھی تو بے علم یا کم لیاقت لوگ مراتب عالی پر نظر آئے۔ اور یہ ناگوار گزرا۔ اکثر چھوٹے تھے کہ آنکھوں کے سامنے بڑے ہوئے یا برابر سے آگے بڑھ گئے۔ کبھی باہر سے آئے اور مختلف خدمات کی سنہری مسندوں پر بیٹھ کر صاحب جاہ وجلال ہوگئے۔ اور یہ ملّا کے مُلّا ہی رہے۔ ایسے لوگوں کی ان کی فضیلت علمی ضرور خاطر میں نہ لاتی ہوگی۔ بلکہ چاہتی ہوگی کہ میرا ادب پیش نگاہ رکھیں۔ ادھر

دولت اور حکومت کو اتنا دماغ کہاں؟ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایسے موقع پر دونوں طرف سے کوتاہیاں اور قباحتیں ہوتی ہیں۔ اہل علم کو تو ان پر غصہ ہونے کے لیے کوئی سبب درکار ہی نہیں۔ فقط اہل دول کی سواری اپنے جاہ وحشم کے ساتھ برابر سے نکل جانی کافی ہے۔ اگر وہ اپنے کاروبار کے افکار میں غلطاں وپیچاں جاتے ہوں تو بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ رے تمہارا غرور آنکھ بھی نہیں ملاتے کہ ہم سلام ہی کرلیں۔ امارت کے تو مالک بن گئے۔ بھلا کوئی دوسطریں ہم لکھ دیں پڑھ بھی لوگے؟ اور اہل دول میں بھی اکثر کم ظرف ہوتے ہیں کہ جب کسی درجے پر پہنچتے ہیں۔ تو اپنا سلام علما کے ذمہ فرض سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس پر قناعت نہ کرکے چاہتے ہیں کہ ہماری درباریاں کریں۔ اور چونکہ بادشاہ کی خلوت جلوت میں دخل رکھتے ہیں انہیں ان غریبوں کے کاروبار میں بولنے کے لیے بہت موقع ملتے ہیں۔ چنانچہ کبھی ان کے کاموں میں خلل ڈالتے ہیں۔ کبھی ان کی تصانیف پر جس کی عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے ناک بھوں چڑھا دیتے ہیں۔ اور مصنف کے دل سے کوئی پوچھے تو اس کے دین ودنیا کی کائنات وہی ہے۔ کبھی نالائق کو لاکر ان سے بھڑا دیتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں کی سفارشوں کو رفاقت میں لے کر انہیں آگے بڑھا لے جاتے ہیں۔ یہ باتیں رفتہ رفتہ دشمنی کا درجہ حاصل کرلیتی ہیں اور جب کہیں ان کا مقدمہ پیش پاتے ہیں تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خراب کرتے ہیں۔ غریب اہل علم سے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہاں قلم اور کاغذ پر ان کی حکومت ہے۔ یہ بھی جہاں موقع پاتے ہیں۔ اپنے گھسے ہوئے قلم سے وہ زخم دیتے ہیں کہ قیامت تک نہیں بھرتے۔

ان کی تاریخ اپنے مضمون ومقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ الماری کے سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے۔ سلطنت کے عمومی انقلاب اور جنگی مہمات سے ہر شخص آگاہ ہوسکتا ہے لیکن صاحب سلطنت اور ارکان سلطنت میں سے ہر ایک کے اطوار واسرار اور نہان وآشکار سے جو وہ آگاہ تھے۔ دوسرا نہ ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تصنیف کے سلسلے اور فضائل علمی اور علم مجلسی وغیرہ ان کے اوصاف۔ اکبر کی خلوت ودربار میں ہمیشہ پاس جگہ حاصل کرتے تھے

اور ان کے معلومات اور حسن صحبت کے لطائف سے امرائے دربار اپنی دوستانہ صحبتوں کو گلزار کرتے تھے۔ علما، وفقرا اور مشائخ تو ان کے اپنے ہی تھے۔ لطف یہ ہے کہ انہیں میں رہتے تھے۔ مگر خود ان کی قباحتوں میں آلودہ نہ ہوتے تھے۔ دور کے دیکھنے والوں میں تھے۔ اس لیے انہیں محسن وقبح خوب نظر آتا تھا۔ اونچی جگہ پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے ہر جگہ کی خبر اور ہر خبر کی تہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اکبر اور ابوالفضل وفیضی اور مخدوم وصدر سے خفا بھی تھے۔ اس لیے جو کچھ ہوا صاف صاف لکھ دیا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ طرز تحریر کا بھی ایک ڈھب ہے۔ یہ خوبی ان کے قلم میں خداداد تھی۔ ان کی تاریخ میں یہ کوتاہی ضرور ہے کہ مہمات اور فتوحات کی تفصیل نہیں۔ اور واقعات کو بھی مسلسل طور پر بیان نہیں کیا۔ لیکن اس خوبی کی تعریف کس قلم سے لکھوں کہ اکبری عہد کی ایک تصویر ہے۔ جزئیات اور اندرونی اسرار ہیں کہ اور تاریخ نویسوں نے مصلحتاً یا بے خبری سے قلم انداز کر دیے۔ ان کی بدولت ہم نے سارے عہد اکبری کا تماشا دیکھا۔ باوجود ان باتوں کے جو کم نصیبی ان کی ترقی میں سنگ راہ ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ زمانے کے مزاج سے اپنا مزاج نہ ملا سکتے تھے۔ جس بات کو خود برا سمجھتے تھے۔ اسے چاہتے تھے کہ سب برا سمجھیں اور اسے عمل میں نہ لائیں جس بات کو اچھا سمجھتے تھے اسے چاہتے تھے کہ اسی طرح ہو جائے۔ قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا۔ اسی طرح زبان میں زور تھا۔ اس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے رہا نہ جاتا۔ اس عادت نے مجھ نا قابل کی طرح ان کے لیے بھی بہت سے دشمن بہم پہنچائے تھے۔

وہ حقیقت میں مذہبی فاضل تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور حدیث کو خوب حاصل کیا تھا۔ عشق کی حرارت سے دل گداز تھا۔ تصوف سے طبعی تعلق تھا۔ علوم عقلی کو پڑھا تھا۔ مگر اس کا شوق نہ تھا۔ زیادہ تر عادتیں اس لیے بگڑی تھیں کہ ان کی فضیلت نے شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانے میں پرورش پائی تھی۔ ان بادشاہوں کا خیال قدیمی اصول کے بموجب یہ تھا کہ ہند ہندوؤں کا ملک ہے۔ ہم اہل اسلام ہیں۔ مذہب کے زور سے اتحاد اور اتفاق پیدا

کریں۔ جب ان پر غلبہ اور قدرت پائیں گے۔ مصنف مذکور اگر اس عہد میں ہوتا تو خوب نقل پاتا۔ مگر اتفاقاً زمانہ کا ورق الٹ گیا۔ اور آسمان نے اکبر کے اقبال کی قسم کھالی۔ اکبر کے ہاں بھی پندرہ برس تک قال اللّٰہ اور قال الرسول کے چرچے رہے۔ اور اہل علم اور اہل فقر کے گھروں میں رات شب قدر اور روز نوروز ہوتے رہے مگر مسائل علمی کے ہجوم میں کبھی کبھی معقولات بھی دربار میں گھس آتے تھے۔ معقول بادشاہ کو معقولات کی معلومات کا بھی شوق پیدا ہوا۔ ہر ایک زبان، ہر ایک مذہب اور ہر علم کے عالم دربار میں آئے۔ بلکہ قدردانی سے بلائے گئے پہلے شاعری کی سفارش سے فیضی آئے۔ ان کا دامن پکڑ کر ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ بہت سے فاضل ایران وتوران کے پہنچے۔ اسی ضمن میں یہ بھی ثابت ہوا کہ مذہب کا اختلاف جس نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو گروہ باندھ باندھ کر ایک کو دوسرے کے لہو کا پیاسا کر دیا ہے۔ نہایت خفیف اور اعتباری فرق ہے اور اس اختلاف میں زیادہ کاوش کریں۔ تو بنی آدم یعنی ایک دادا کی اولاد میں تلوار درمیان آجاتی ہے۔ اور بہشت اور دوزخ کا فرق جا پڑتا ہے۔ اس لیے اکبر کے خیالات بدلنے شروع ہوئے۔ اس نے کہا انسان اُنس سے نکلا ہے۔ خدا نے اسے مل کر رہنے کو بنایا ہے۔ اس لیے ملنساری اور اتحاد و ارتباط کو اصولِ سلطنت قرار دینا چاہیے۔

پُرانے عالم پُرانی باتوں کے خوگر فتہ تھے۔ انہیں یہ باتیں ناگوار ہوئیں۔ اکبر نے انہیں رستہ پر کھینچنا چاہا۔ انہوں نے گردنیں سخت کیں ناچار یا توڑنا یا بیچ سے ہٹانا واجب ہوا۔ ان خیالات کی ابتداء تھی جو فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ اس نے اوّل اوّل ترقی کے قدم خوب بڑھائے۔ یہ نوجوان عالم اپنے علم کے جوش اور ترقی کی اُمنگ میں تھا۔ بڈھے ملّانوں کو اور ان کی بڈھی تعلیم کو توڑ توڑ کر اکبر کو خوش کیا۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ اصول میرے اور بڈھوں کے ایک ہیں۔ اور اب زمانے نے نیا مزاج پکڑا ہے۔ انہیں توڑوں گا تو ساتھ ہی آپ بھی ٹوٹ جاؤں گا۔ غرض کچھ تو اس سبب سے کہ اس نے پرانی تہذیب کے دامن میں پرورش پائی تھی اور کچھ اس کی طبیعت بھی ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اس لیے وہ نئے زمانے

میں پرانے مسائل کو واجب العمل سمجھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مخالفت شروع ہوئی۔ اور چونکہ فقط فضل وفیضی (اس کے خلیفہ اور استاد بھائی) ہی نئے خیالات نہ رکھتے تھے بلکہ زمانہ کا مزاج بدلا ہوا تھا۔ اس لیے اس کے مزاج نے کسی سے موافقت نہ کھائی۔ اس کی تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زمانہ سے لڑائی باندھے بیٹھا ہے۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر شریعت کا ٹھیکہ لیے ہوئے تھے۔ مگر وہ انہیں بھی قابل موافقت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ دیانت اور امانت اور سچے دل سے شریعت کی پابندی چاہتا تھا۔ اور ان بزرگوں کا حال جو کچھ تھا وہ معلوم ہوا اور کچھ اس کے حال میں معلوم ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ یہ دونوں بلکہ کوئی مشہور عالم یا نامی عارف نہیں جو اس کے شمشیر قلم سے زخم نہ ہوا ہو۔

(دربارِ اکبری)

مثنوی موسوم بہ وداع انصاف

جب طور دمِ صبح شبِ تار کا بدلا
اور رنگ چمن میں گل وگلزار کا بدلا

شبنم نے گہر فرش کئے خاک کے اوپر
اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر

چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے
اور چاند پہ جانوں کو لگے وارنے سارے

آئی جو صبا لوٹ کے نسرین وسمن میں
انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں

لی صبح کے پہلو پہ اُدھر رات نے کروٹ
لی خاک پہ یامستِ خرابات نے کروٹ

زاہد جو افیمی کی طرح جھوم رہا تھا
اور بیٹھا مصلے پہ زمیں چوم رہا تھا

بیدار ہوا سُن کے مؤذن کی اذاں کو
آزاد جو تھا صرفِ سخن کر رہا جاں کو

ہشیار ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے
اور وقت سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے

تا فیضِ سحر سے ہو دلِ زار شگفتہ
اور ہو کوئی دم جانِ پُر آزار شگفتہ

پر طائرِ دل جب قفس شہر سے نکلا
اور قلزم افکار کی میں لہر سے نکلا

دیکھا کہ سوئے دشت ہے دنیا چلی جاتی
اور خلق ہے دوڑی سوئے صحرا چلی جاتی

حیرت ہوئی میرے دل بیتاب وتواں کو
اور پوچھا ہر ایک شخص سے اس رازِ نہاں کو

پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نہ کسی نے
اس پردۂ حیرت کو اٹھایا نہ کسی نے

آخر کو نظر عقل نظر باز سے لے کر
اور شوق کے بازو پر پرواز سے لے کر

پابند بہ رفتار زمانہ ہوا میں بھی
ساتھ اُن کے سوئے دشت روانہ ہوا میں بھی

جب شہر کے میدان سے ہم دور تر آئے
اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے

دیکھا کہ سرِ راہ کچھ اشجار ہرے ہیں
دامانِ تمنا کو طراوت سے بھرے ہیں

ایک شاہ اُسی جا بہ سرِ خاک ہے بیٹھا
بیٹھا ہے مگر سخت غضبناک ہے بیٹھا

اور سامنے کچھ باندھے ہوئے ہاتھ کھڑے ہیں
کچھ سر برہنہ اور کہ جو ساتھ کھڑے ہیں

وہ آ کے گرے پاؤں پہ بادیدۂ تر ہیں
اور عفوِ جرائم کو جھکائے ہوئے سر ہیں

پرشاہ نے تلوار کو کھولا ہے کمر سے
اور افسرِ شاہی کو بڑھا ڈالا ہے سر سے

دیکھی جو یہ روداد تو حیران ہوا میں
جب حد سے سوا دل میں پریشان ہوا میں

ایک ایک سے پوچھا کہ ہوا واقعہ کیا ہے
اور شہر میں کیا چل گئی وحشت کی ہوا ہے

وہ ہور ہے سب مضطر و ناچار تھے ایسے
اور اپنی مصیبت میں گرفتار تھے ایسے

آتی تھی کسی میں نہ نظریات کی حالت
تھی بات کی حالت نہ اشارات کی حالت

ایک پیر کہن اتنے میں نزدیک تر آئے
اور ہوش بھی کچھ ان کے ٹھکانے نظر آئے

یہ عقدۂ سربستہ رکھا سامنے ان کے
کھولا یہ معمہ لب ناکام نے ان کے

یعنی کہ ہے یہ شاہ شہنشاہ مروت
تھی اس سے زمانہ میں رواں راہِ مروّت

اب اس نے جو دیکھا کہ ہے رنگ اور یہاں کا
ایمان ٹھکانے نہ رہا اہلِ جہاں کا

دنیا ہے بگڑی ہوئی ایک ایک کی نیت
اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیت

اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا
اور سلطنتِ خلق سے منہ موڑ کے اپنا

ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو ان کے
تا ان کی سزا سونپ کے اعمال کو ان کے

خود گوشۂ عزلت میں گزارہ کرے اپنا
سر خاک پہ ایک ایک یاں مارا کرے اپنا

اتنے میں جو تھے لوگ پس و پیش پریشاں
تھے نیک و بد اُن میں بہ دلِ خویش پریشاں

سب مل کے فراہم ہوئے اور متصل آئے
ہر چند کہ تھے دل میں بہت منفعل آئے

لیکن تھا ہجوم ایسا بکثرت نظر آتا
تھا دل میں تصور یہ مرے بیشتر آتا

یارب یہ زمیں سے ہیں کہ افلاک سے آئے
یا مُردہ نکل کر ہیں تہِ خاک سے آئے

اُس بھیڑ میں آشوب سا ایک دفعتہً آیا
یا پانی کا ریلا جو تھا موج زن آیا

جو راس و چپ اُن میں تھے وہ راس ہوئے سب
میں جن میں کھڑا دور تھا وہ پاس ہوئے سب

پہنچا تھا میں اب فاصلہ پر مدنظر کے
کی جب کہ نظر شوق کے شانوں پہ ابھر کے

دیکھا ہوا استاد ہے سلطانِ مروّت
کرتا ہے عیاں حال پریشان مروّت

اب کھولتا ہے تیغ کو ہمت کی کمر سے
اور ہاتھ میں ہے افسر شاہی لیا سر سے

گو چشم غضب ناک سے ہے قہر ٹپکتا
پر لب سے غم و یاس کا ہے زہر ٹپکتا

اور کہتا ہے وہ بادشہ معدلت اندیش
ایک ایک سے کہ اے غرقہ ناعاقبت اندیش

بھیجا ملک القدس نے تجھے مجھ کو جہاں میں
تا خلق خدا جو ہو زمیں میں کہ زماں میں

ہو دین وہی اُن کا جو ہے دین مروّت
اور نظم و نسق ہووے بہ آئین مروّت

آپس کی رفاقت سے چلیں کام سبھوں کے
نیکی سے ہوں مشہور جہاں نام سبھوں کے

پیدا جو خدا نے کیا کون و مکاں کو
اور عالم اسباب بنایا ہے جہاں کو

کام ایک پہ ہے ایک کا یہاں منحصر ایسا
اور ان میں بہم سلسلہ باندھا ہے پھر ایسا

جس سلسلہ بندی کی جدائی نہ ہو ممکن
اور ہو کے جُدا کارروائی نہ ہو ممکن

مِل جُل کے زمانے میں گذارے ہوں سبھوں کے
آپس کی مروّت پہ سہارے ہوں سبھوں کے

اور سب کو سہارا ہو خداوند جہاں کا
اُس بن ہو گزارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

پریاں تو ہیں سب بادہ نخوت پئے بیٹھے
دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لئے بیٹھے

گذری ہوئی گردوں سے ہے گردن کشی ان کی
اور اس پہ وہ خودرائی وخود مطلبی ان کی

نیکی یہ سمجھتے ہیں خلائق کو بدی کو
اور دیکھ نہیں سکتے زمانہ میں کسی کو

افسوس کہ رتبہ میرا جانا نہ کسی نے
اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے

لیکن جو زمانے میں یہی کام ہیں اس کے
خود دیکھیں گے ایک دن جو کچھ انجام ہیں ان کے

ہر چند ہیں آج اہل زمانہ مرے دشمن
اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن

پر ہونے دو ان کو جو ہیں سب برسرِ کیں یہ
جائیں گے کہاں بچ کے یہیں میں ہوں یہیں یہ

یہ سن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا
اور اتنے میں ایک طرفہ تماشا نظر آیا

دو شخص سرِ معرکہ واں دفعتاً آئے
اور شاہ کے پہلو میں بدر ومحسن آئے

سر اپنے جھکائے ہوئے غم ناک تھے دونوں
اور درد سے بادیدۂ غم ناک تھے دونوں

دونوں کی وزارت تھی بہ دربار مروّت
اور چلتا انہی دونوں سے تھا کار مروّت

ایک اُن میں کہ تھا برف نے ڈھالا بدن اس کا
تھا اُس کا بڑھاپا نمدی پیرہن اُس کا

وہ خلق خدا میں تھا جو غم خوار سبھی کا
اور آنکھ سے دکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا

جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا
اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گھلا جاتا تھا گویا

وہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اس کا
تمغائے وزارت پہ رقم نام تھا اس کا

ایک دوسرا شخص اور جو ہمراہ تھا اُس کے
چہرہ پہ برستا حشمِ وجاہ تھا اُس کے

وہ نسخہ حیرت بہ نگاہ عقلا تھا
اور تن پہ جو کی غور تو کنون سے ڈھلا تھا

کچھ توڑے زر نقد کے تھے ہاتھ میں اس کے
صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُس کے

پر ہاتھ میں توڑے جو پُر از دام ودرم تھے
خالی تھے بہت اُن میں بھرے رہ گئے کم تھے

عالم میں سخاوت سے کرم اُس کے لقب تھا
اور بارِ وزارت وہ اٹھائے ہوئے سب تھا

دنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے اُس کے
سمجھا یہ مناسب دل آگاہ نے اُس کے

میرے عمل خیر کی یاں قدر نہیں ہے
اور دور بخیلوں کا تہِ چرخ بریں ہے

ہیں بسکہ بداندیش پئے خلق خدا یہ
دنیا تو جہنم میں گیا دیویں گے کیا یہ

دل سینۂ گندم سے بھی ہے تنگ تر ان کا
دیتے کو جو دیکھیں تو ہے پھٹتا جگر ان کا

اب یاں سے چلا شاہ خوش اقبال ہے اپنا
جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا

دونوں وہ غرض باندھ کے دستِ ادب آئے
اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیرلب آئے

بے شبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے
یہ ملک فنا قابل آرام نہیں ہے

افسون وفسانہ پہ یہ دل دادہ ہیں سارے
اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سارے

حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے
اب یہ رہیں گمراہ یہی ان کی سزا ہے

پر شاہ سے یہ عرض نمک خوار ہیں کرتے
اور مصلحت وقت کو اظہار ہیں کرتے

گو اہلِ جہاں پھیرے ہیں رُخ راہِ وفا سے
اور باندھے ہیں پیمانِ وفا مکرو دغا سے

پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں
اور جوہر اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں

سلطانِ مروّت کو ہیں جو شاہ سمجھتے
اور شاہ کو ہیں سایہ اللہ سمجھتے

یہ وضع زمانہ کی خوش آئی نہیں اُن کو
ان قدموں سے منظور جدائی نہیں اُن کو

باقی نہیں دنیا کی ہوس کوئی رہی ہے
اب اُن کو تمنّا جو رہی ہے تو یہی ہے

ہم یعنی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں
اور بندہ حق وہ ہے جو ہے بندۂ احساں

جو جو کہ شرف پائے ہیں اس فیض کرم سے
شکر اُن کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے

ایک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے
اور جوش جو ہیں جان ہوا خواہ کے اپنے

وہ رنگ میں شکریہ کے ہیں اس آن نکالیں
اور سینوں میں جو کچھ ہیں وہ ارمان نکالیں

جب لب پہ یہ اُن کے سخن پر اثر آئے
اس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے

گزرے دل غم گیں پہ خیالات ہزاروں
اور پیشِ نظر پھر گئے حالات ہزاروں

کچھ بعد تامل کے مگر اُن سے کہا یہ
اُن کی جو تمنا ہے تو پھر بات ہے کیا یہ

گو روکتا میرا دلِ مجبور ہے مجھ کو
پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھ کو

دی جب کہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے
شہرت کی منادی سے وہیں سن لیا سب نے

پابند مروت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں
اور جلوہ نما جوہر اخلاص تھے اُن میں

ہر سمت سے وہ فرقہ بہ فرقہ ادھر آئے
اور شاہ کے شکریئے کو بہ چشم تر آئے

ایک فرقہ کا احوال نظر طُرفہ تر آیا
وہ سب سے مقدم تھا قدم مار کر آیا

دولت تھی زر و سیم لٹاتی ہوئی آگے
اور دور سے تھی نور اڑاتی ہوئی آگے

شہرت کی دوامی نے کیے نام تھے روشن
آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن

امیدیں خلائق کی جو تھیں اُن کی طرف تھیں
اور آنکھیں زمانے کی لگیں اُن کی طرف تھیں

تھے اہل جہاں گرد امنڈ آئے ہزاروں
اور دامنِ امید تھے پھیلائے ہزاروں

تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ
اور دن سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ

تھے نور بقا شمع جلائے ہوئے آگے
ہاتھوں کے دیئے سب کے تھے آئے ہوئے آگے

پر شکل سے ملبوس سے اور طرز سخن سے
تھے مختلف الوضع جو وہ اصل وطن سے

میں اُن میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا
اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہنچا نہ سکتا

وہ فرقہ مگر جب میرے نزدیک تر آیا
اور اُن میں مجھے حاتم طائی نظر آیا

سمجھا کہ سخاوت کے یہ پروردہ ہیں سارے
اور چشم مروّت کے نظر کردہ ہیں سارے

بعد اُن کے جو اشخاص کہ آتے نظر آئے
وہ شان و شکوہ اور دکھاتے نظر آئے

تھے دولت و اجلال جلو میں لئے آتے
اور سر پہ ہُما اُن کے تھے سایہ کئے آتے

تھے چتر شہی ہو رہے قربان سروں پر
اور تاج خدا کر رہے تھے جان سروں پر

پر دخل نہ واں تک تھا ذرا تاج زری کا
افسر تھا سرِ فرق دھرا ناموری کا

لہرا رہے ایک ایک کے سر پر جو علم تھے
اعزاز دوامی کے نشان پہ رقم تھے

تھے اُن پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے
تا حشر رہیں گے سحر و شام چمکتے

تھے نور سے تمکین و وقار ان پر برستے
اور پھولوں سے تھے رنگ بہار اُن پہ برستے

یکساں تھے بہ حیثیتِ اقبال وہ سارے
پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے

کچھ رازِ نہاں دل پہ ہوا جس کا عیاں تھا
کسریٰ لقب اُن میں شہِ نوشنبہ رواں تھا

میں سمجھا کہ ایسے جو بہ تمکین ہیں آتے
اقلیم عدالت کے سلاطین ہیں آتے

(کلیاتِ آزاد)

گلشن اُمید کی بہار

انسان کی طبیعت کوخدا نے انواع واقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں، مگرزمین جس قدرتخم اُمید کو پرورش کرتی ہے اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی اور اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کرا ٹھتی ہیں یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالتِ موجودہ ہماری خوش حال یا بدحال بھی ہوسکتی ہے اسی وقت اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہرزمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ اورنئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں پھر بھی یہ جادونگار مصوّر ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی بیماری قید، مسافرت بہت سے دنیا کے دُکھ درد ہیں کہ اُمید نہ ہوتو ہرگز نہ جھیلے جائیں آساجئے نراسامرے یہ نعمت جو بظاہر ہرکس وناکس میں عام ہو رہی ہے وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کواس صورت سے بے نیاز نہیں کرسکتی کیوں کہ حقیقت میں یہ مشغلہ زندگی کے بہلاوے ہیں، اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گزارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا نا گوار
پر اُمید وصل پر برسوں گوارا ہوگیا

اس میں شک نہیں کہ اُمید دھوکے بہت دیتی ہے اوران باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے، جوانسان کو حاصل نہیں ہوسکتیں، مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی ہوتی ہے تو اُسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کردیتی ہے میں ایک رات انھیں خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہوجاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانہ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے اُمید وبیم اور نفع ونقصان کے سامان تیار کرلیتا ہے۔ یکا یک آنکھ لگ گئی دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں اُمید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانہ ہے آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین وشاداب ہے۔ ہر چمن رنگ وروپ کی دھوپ سے چمکتا خوشبو سے مہکتا ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصلِ بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہورہی ہے اور رنگارنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہوگیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دلکشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دُور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں، آبِ زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کررہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں، جو جانور دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں، چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں، مگر یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں اُن کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں، اس لطف نے اور آگے

بڑھنے کو للچایا۔ چنانچہ قدم اُٹھایا، مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا۔ کیونکہ جوہر یا ولی سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی۔ پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی اور میوے تو گر ہی[1] چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں وہ آگے آگے اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا۔ اور جو بہاریں تھیں وہ ہر قدم پر سامنے ہی تھیں مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں[2]۔ گویا میرے شوق آرزو کو ڈھکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگین ہوتے، ہوتے دق ہو گیا تھا، مگر دل کے کان میں کوئی یہ ہی کہے جاتا تھا کہ چلے چلو۔ جو نعمتیں ڈھکا رہی ہیں کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا کہ جس میں زن مرد، خورد و کلاں بہت سے آدمی اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں یا کسی نشاطِ عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے منہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا، اور ایک ایک آنکھ سرمہ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ ایک خاص قسم کی ہے کہ وہ اسی کے دل میں ہے سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا، اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارہ کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزومند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو تو انھیں اس کے بجھانے کی فرصت نہیں[3]۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا گیا۔ آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ نہ ہو سکتا تھا[4]۔ میں نے خیال کیا کہ بڈھے کو اب

---

[1] انسان کی طبیعت کا عجیب حال ہے جو ہوس پوری ہو جاتی ہے۔ وہ مزہ نہیں دیتی اس سے آگے کے لطف دل میں ارمان اور ذوق شوق پیدا کرتے ہیں۔

[2] انسان جس مقصد کے لیے کوشش کرتا ہے کسی سے کب کہتا ہے اندر ہی اندر تدبیریں کرتا ہے۔

[3] اپنے کام کے آگے کسی اور کی احتیاج کی کون پرواہ کرتا ہے۔

[4] سچ ہے بڈھوں کے جوانوں سے زیادہ ہوش ہوتی ہے۔

کیا ہوس ہوگی اُسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو، چنانچہ اُسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری بدل کر منھ پھیر لیا۔ اور کہا'' صاحب دق نہ کیجئے، آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائے گا، افلاس زدہ اور طالب رمز گار بچارے ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں وہ بھی بازو ڈال کر آرام سے بیٹھ جائیں گے میں نے بڈھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالے کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمت شکل اور آہنگیِ رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید کچھ اخلاق سے پیش آئے مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو..... اس نے جھک کر سلام کیا اور کہا'' اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں کیوں کہ بیس برس سے میں ایک عہد کی امیدواری کر رہا تھا اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔'' میں نے اُسے بھی چھوڑا اور ایک اور کو جالیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کر لے، کیوں کہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص کو دیکھا کے بے تحاشہ بھاگا چلا آتا تھا اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا ہے۔ یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے۔

ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے۔ اور سرکار علم سے انعام کا اُمیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور آپ دیکھو، کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا اور آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے اسے دیکھ دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے ٹٹولنا چاہیے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اُسے بھی سُنایا۔ وہ ہنسا اور کہا، صاحب جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ ملکۂ اُمید کا باغ ہے وہ ملکۂ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا

سامنے دیکھو بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لیے کھڑی ہیں جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا یہ انہی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں آنکھ اُٹھا کر دیکھوں تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالیشان ہے اور اس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزارِ جوانی عین بہار پر ہے، سرِ تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اس کے زیرلب پارہ کی طرح ٹوٹتی ہے، لعل و جواہر تاج مرصّع موتیوں کے ہار، خلعت زرنگار کشتیوں میں چنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہاں کی نعمتیں سجائے اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہارِ زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے، عیش مدام اور فرحت ودام سے چہرہ روشن ہے اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہ ہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے اور اسی بھروسہ پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا رستے کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی۔ مگر ہرے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ دیواریں لپی ہوئیں، دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا۔ ''قناعت کا آرام گھر''، بعض تھکے ماندے ان میں چلے آتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے راستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گیے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

باغ اُمید کے دو[۲] دروازے

یہ دیکھ کر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی، اور جمگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا، وہاں سے معلوم ہوا کہ باغ اُمید کہ اندر جانے کے دو دروازے ہیں، ایک داروغہ دانش کے اختیار ہے۔ دوسرا داروغۂ خیال کے تحت میں ہے۔ داروغۂ دانش ایک تند مزاج اور وسواسی شخص ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور الٹی سیدھی حجتیں نہیں کر لیتا تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا مگر داروغۂ خیال خلیق اور ملنسار شخص ہے وہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا ہے۔ بلکہ جو اس کی حد میں جائے اس سے بڑی عزت وتوقیر کے ساتھ پیش آتا ہے، چنانچہ جو لوگ داروغہ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے یا جنہیں اس نے جانے نہیں دیا تھا ان لوگوں کی بھیڑ اس کے دروازے پر لگ رہی تھی۔ داروغہ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تخت گاہ خاص کو رستہ جاتا تھا۔ مگر اس راہ کی زمین پھسلنی سڑک پتھریلی، رستے ایسے اپچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں جب کسی قسمت والے کو داروغہ سے اجازت مل جاتی تھی تو اس کی کٹھن گھاٹی میں دُکھ بھرنے پڑتے تھے، اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اپچ پیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے ان میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے۔ مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں جن کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ جہاں صاف سیدھا راستہ سمجھے ہوئے تھے وہاں کچھ ایسا تہلکہ پیش آتا تھا کہ یکا یک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں الجھاؤں میں الجھتے تھے صدر ہا رپٹنوں میں رپٹتے تھے۔ بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے غرض ایسی ایسی خطرناک وارداتیں اور ناکامی کے صدمے تھے کہ

بہت آدمی تو پہلے ہی دھارے میں الٹے پھر آتے تھے۔ بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے۔ بعض بعض ایسے بھی تھے کہ ان کی استقلال سے راہ تھی۔ وہ اس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے تھے۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلہ کو دیکھ کر پچھتاتے تھے کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی۔ یہ تو کامیابی نہیں ہوئی حق تلفی ہے باقی جو لوگ کہ انعام لے کر پھرتے تھے۔ ان کا انجام یہ ہوتا تھا کہ دانائی داروغہ دانش کی بی بی ملکہ کی مصاحب تھی وہ ان کا ہاتھ پکڑتی تھی۔ اس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔

اے راہ اُمید کے مسافرو! چونکہ داروغہ دانش کی حجتیں اور ان کے رستے کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں اس لیے میں نے داروغہ خیالی کی طرف رُخ کیا یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی۔ مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی۔ وہ یہاں سے سرتاپا ساری نظر آتی تھی، اور اپنے عجائب وغرائب نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر حُسن طلب کے انداز دکھاتی تھی۔ جس سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو نگاہ مجھ پر ہے وہ کسی پر نہیں اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی اُمید نہیں اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا۔ پہاڑ اس خیالی رستے کی طرف ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم نہ ٹھہر سکتا تھا۔ کیوں کہ وہمی باتوں میں، پائداری کہاں؟ باوجود اس کے آمدورفت کے نشان بہت کثرت سے تھے۔ کیوں کہ اس رستے میں چلنے والے بہت ہیں۔ اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو رستہ میں نے پایا ہے وہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔

یہ بلا نصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے، بعض تو ایسے کل پر وار لگانے کی فکر میں

یہ باتیں ہم پر روز گزرتی ہیں مگر کوئی خیال نہیں کرتا دیکھو یہاں انھیں کس خوبصورتی سے رنگ دے کر بیان کیا ہے عقل جب تک سب تدبیروں اور تجویزوں کے پورے بندوبست نہیں کر لیتی تب تک کسی اُمید پر کوشش کرنے کی اجازت نہیں دیتی، وہم گمان کے بندے ذرا سا سہارا دیکھتے ہیں اور اُٹھ دوڑتے ہیں، وہی ٹکراتے ہیں اور ناکام ہوتے ہیں۔

تھے کہ جن کی حرکت کبھی تھمے ہی نہیں، بعض کہتے تھے وہ جو ہو سو ہو، انہی قدموں سے چلے جاؤ بلا سے مر جاؤ۔ یہ سب حکمتیں کرتے تھے۔ اس پر بھی زمین سے اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ اور اُٹھے تو وہی گر پڑے مگر یہاں پڑے تھے تاک اُدھر ہی لگی تھی اور اس حال طبع پر خود پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ان پر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے جنہوں نے اس باغ میں اگر اوروں کی طرح چڑھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا یوں ہی ایک جگہ پڑ رہے تھے۔ یہ مقام کاہل گھاٹی کہلاتا تھا۔ اور ایک سنسان اور بے آزاد موقع پر تھا۔ مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی۔ یہ اسی یقین میں خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آنا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اور لوگ ان وہمیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے، مگر انہیں کچھ پرواہ بھی نہیں تھی۔ بلکہ یہ غم غلط لوگ اسی دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظر عنایت ہوگی۔

ان ہی بے پرواہوں میں بھی پڑا پھرتا تھا۔ ان میں اتنا لطف پایا کہ اگر کوئی بات کرے تو اس کا جواب دیتے تھے۔ اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے۔ اسی خیال میں یکا یک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ دیوڈراؤنی صورت بھیانک مورت اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں کہ ان کی کسی کو خبر نہیں ایک کو تو میں جانتا تھا کہ عمر ہے، مگر دوسرا افلاس تھا۔ ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہو گئے اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہو گیا۔ دلوں پر خوف ہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلائے تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا۔ اسی سے میں چونک پڑا اور دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔